سوغات

سہ ماہی

پہلا شمارہ

مدیر:
محمود ایاز

فی پرچہ
دو روپے

پہلا شمارہ

مدیر
محمود ایاز

قیمت
دو روپے

پتہ
۲۷ ، کلائن روڈ بنگلور ۔ ۵

جنوری ۱۹۵۹ء

مقامِ اشاعت ——— ۲۷، کلائن روڈ، بنگلور ۵

طباعت ——— پاسبان برقی پریس، بنگلور ۱

قیمت ——— فی پرچہ: ۲ روپے۔ سالانہ: آٹھ روپے

نوٹ

خریداروں کو پرچہ بک پوسٹ کے ذریعہ روانہ کیا جاتا ہے۔ جو حضرات سالانہ چندہ کے ساتھ رجسٹری کا خرچ بھی روانہ کریں گے ان کو پرچہ بذریعۂ رجسٹرڈ پوسٹ بھیجا جائے گا۔ بصورتِ دیگر ادارہ پرچہ کی عدم وصولی کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔

فہرست

خفشِ اوّل — صفحہ ۵

مضامین

افسانے

غزلیں، نظمیں

سوغات

تبصرے

اشتہارات

نقشِ اوّل

ادبی تخلیق کے سلسلہ میں ناسازگار ماحول کی شکایت نئی نہیں ہے فنی کام کرنے والوں کو ہمیشہ کس مپرسی، ناقدردانی اور عوامی ذوق کے عامیانہ پن کا شکوہ رہا ہے۔ اگر موجودہ نسل کی نشو و نما رومانی اور جاسوسی ناولوں، فلمی رسائل اور دیگر ہیجان خیز کتابوں کے زیر اثر ہو رہی ہے۔ تو اس سے پہلے بھی صورت حال کچھ مختلف نہیں تھی۔ بلکہ اگر پڑھنے والوں کی تعداد اور لکھنے پڑھنے کے عام مذاق کو ملحوظ رکھا جائے تو بظاہر موجودہ دور یقیناً زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس سطحی مشاہدہ سے قطع نظر حقیقت ہے کہ شعر و ادب اور فنی کارناموں کی تخلیق اور مقبولیت کے لئے یہ دور بے حد پُرآشوب ثابت ہو رہا ہے۔ فنکاروں، دانشوروں کو کسی بھی دور میں پھولوں کا بستر میسر نہیں تھا لیکن آج انہیں جن مسائل اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان کی نوعیت اور اہمیت بالکل جداگانہ ہے۔ آج نہ صرف لکھنے والے بلکہ خود فن و ادب جس طرح خطرہ کی زد میں آ گئے ہیں اس .... کا بہت کم لوگ احساس کر پا رہے ہیں۔ اس لئے میں چاہتا تھا کہ "سوغات" کے پہلے شمارے میں اس موضوع پر ایک سمپوزیم شامل کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ہنری ملر اور پریسٹلے کے مضامین کا بھی خاص طور پر ترجمہ کرایا گیا۔ اور ان ترجموں کی نقلیں کئی ایک اہل فکر نقادوں اور ادیبوں کو روانہ کی گئیں۔ تاکہ ان کی روشنی میں ہمارے ادب اور ادیبوں کے بارے میں سوچنے اور غور کرنے میں سہولت ہو سکے۔ لیکن مجھے اکثر حضرات کے مضامین حاصل کرنے میں کامیابی نہ ہو سکی۔ اور جو مضامین ملے ان میں اتنی رواداری اور سہل انگاری سے کام لیا گیا تھا کہ ان کی اشاعت سے کوئی فائدہ نظر نہ آیا۔ پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ کم از کم "سوغات" کے دوسرے شمارے میں یہ سمپوزیم شامل ہو سکے۔

اس شمارے کے مواد کی فراہمی کے لئے جو کوشش کرنی پڑی ہے اس سے عام پڑھنے والوں کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ لیکن جو لوگ اپنی نیک نیتی اور ناآزمودہ کاری کی بنا پر

ادبی خدمت وغیرہ کی جرأت کا شوق رکھتے ہیں۔ ان کے لئے اس اجمال میں بھی عبرت کا کافی سامان موجود ہے۔ اس شمارہ کے لئے ہند و پاک کے تقریباً تمام اچھے لکھنے والوں سے درخواست کی گئی تھی۔ لیکن کئی حضرات نے چار چار خطوط کے بعد بھی خط کی رسید تک دینی اپنی عظمت کے منافی سمجھی۔ چند ایک اصحاب نے وعدے کئے اور ان کے وعدوں پر اعتبار کا نتیجہ یہ نکلا کہ پرچہ ستمبر کی بجائے دسمبر میں نکل رہا ہے (اور اب بھی ان لوگوں کی شمولیت کے بغیر!!) جن چند ایک مخلص لکھنے والوں نے تھوڑی بہت آنا کانی کے بعد اپنی چیزیں روانہ کیں ان میں کچھ مطبوعہ تھیں تو کچھ اس قسم کی تھیں کہ پرچہ کا معیار تو ایک طرف خود لکھنے والوں کے معیار سے گری ہوئی خطوط لکھیں، اصرار کریں اور جب مضمون، افسانہ یا نظم ملے تو اسے واپس لوٹا دیں — یہ سب سے کٹھن منزل تھی۔ میں نے حتیٰ الامکان کوشش کی کہ بڑے ناموں سے سمجھوتہ نہ کیا جائے اور مجھے اس اصول کی پاسداری کرتے ہوئے بعض ایسے احباب کی چیزیں بھی واپس بھیجنی پڑیں جن کے نام پرچہ کی اشاعت اور فروخت میں کافی مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ مشہور و معروف لکھنے والوں کی غیر معیاری اور تیسرے درجہ کی چیزیں شائع کرنے کی بجائے نیم معروف اور ابھرتے ہوئے فنکاروں کی تخلیقات کی اشاعت میں نے زیادہ اہم سمجھی — اتنا کچھ کرنے کے باوجود مجھے اعتراف ہے کہ یہ شمارہ میں اپنی آرزوؤں کے مطابق نہیں نکال سکا۔ انتخاب کا جو کڑا معیار میں نے مقرر کیا تھا، اس سے خاطر خواہ انصاف نہ ہو سکا۔ اس کی تلافی صرف اس طرح ہو سکتی ہے کہ کم از کم دوسرے شمارے سے "سوغات" کی ہر چیز معیار اول کی ہو۔

اس اعتراف کے ساتھ مجھے یہ غلط فہمی یا خوش فہمی بھی ہے کہ "سوغات" اپنی موجودہ شکل میں بھی مختلف اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ بہر حال اس کا فیصلہ تو آپ کرینگے۔

زیر نظر شمارے میں تینوں تراجم خاص طور پر "سوغات" کے لئے کرائے گئے ہیں۔ ہنری مِلر اور پیٹیلے کے مضامین ادبی انحطاط اور ادبی تخلیق کے راستہ میں دشواریوں کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ ملر کا مضمون ذاتی تاثر کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس سے نفس مضمون کی اہمیت میں کمی نہیں آتی۔ "امریکی کلچر" اور "امریکی طرزِ حیات" کے متعلق خوش فہمی

رکھنے والوں کو طرکے مضامین ضرور پڑھنے چاہئیں۔ ان دونوں مضامین کے ساتھ حسن عسکری کا مختصر مضمون تمتہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس شمارے کا سب سے اہم مضمون ایڈون میور کا "فطری آدمی اور سیاسی آدمی" ہے۔ یہ مضمون آج سے کوئی سولہ سال قبل لکھا گیا تھا اور شاید دو چار برس کے بعد PENGUIN NEW WRITING میں نقل بھی ہوا لیکن وقت کے اس فاصلے کے باوجود یہ مضمون آج بھی اپنی معنویت اور فکرانگیزی کی بدولت بہت غور سے پڑھے جانے کا مستحق ہے۔ اس مضمون کی صدائے بازگشت کوئی سات آٹھ سال سے ہمارے دو ایک ادیبوں کے ہاں بھی سنائی دے رہی ہے بلکہ بعض اوقات تو اس مضمون کی سطریں اور پیراگراف تک جوں کے توں نقل ہو گئے ہیں۔!!

افسانوں کا حصہ اور بہتر بنایا جا سکتا تھا لیکن پرچے کی اشاعت میں مزید دیر ناممکن تھی۔

افسانہ نگاری کے موجودہ دور میں یہ بات نمایاں نظر آ رہی ہے کہ اب افسانہ نگار اپنی کہانیوں میں "کہانی پن" کے قائل ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ بدقسمتی سے برسوں تک یہ گر منٹو کے علاوہ ہمارے بہت کم لکھنے والوں کو معلوم تھا۔ لیکن گذشتہ دس بارہ برس میں افسانہ نگاروں کی جو نسل سامنے آئی ہے اس میں تقریباً سبھی اچھے لکھنے والوں کے ہاں یہ چیز نظر آئے گی بلکہ بعض کے ہاں یہ خوبی خامی کی حد تک پہنچ گئی ہے اور افسانہ اور جاسوسی ناول میں فرق باقی نہیں رہا ہے اور پھر یہ بھی منٹو کا اثر سمجھئے یا موپاساں کی روایت کی تجدید کہ آجکل افسانے کے اختتام پر قاری کو چونکا دینے کی ٹیکنیک بھی مقبول عام ہوتی جا رہی ہے۔ یعنی اختتام پر افسانے کو TWIST دیکر کوئی ایسی بات یا واقعہ پیدا کر دینا جو پڑھنے والے کی توقعات کے برخلاف نکلے اور اسے چونکا دے۔ یہاں بھی بہت زیادہ فنی مہارت اور ضبط و توازن کی ضرورت ہے ورنہ قارئین کو چونکانے کی کوشش میں افسانہ منطقی اور نفسیاتی تسلسل سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ افسانہ کا اختتام خلاف توقع ہو تو ہو لیکن خلافِ عقل نہیں ہونا چاہئے۔ زیرِ نظر شمارے کے دو افسانوں میں یہی ٹکنک برتی گئی ہے۔

جیلانی بانو کے افسانہ کی اٹھان، ترتیب اور تعمیر بہت اچھی ہوئی ہے۔ لیکن اختتام پر غانساماں کی خودکشی زیادہ فنکارانہ اظہار کی متقاضی تھی۔ اس نقطۂ نظر سے "امر شہید" میں ضمیر الدین احمد زیادہ کامیاب رہے ہیں۔ ان کا افسانہ طنز کو مزاح کے پیرایہ میں پیش کرنے کی اچھی کوشش کی ہے۔ "ترکیب رو سیاہ" میں واجدہ تبسم نے ازدواجی زندگی کے ایک نفسیاتی مسئلہ کو پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی زبان ہے۔ زبان و بیان کا یہ بہاؤ، لب و لہجہ اور تیور عصمت کے بعد اگر کسی کے ہاں نظر آتے ہیں تو واجدہ تبسم کے ہاں۔ لیکن اگر وہ ہشیار نہ رہیں تو اظہار و بیان کی یہ طاقت ان کی کمزوری بھی بن سکتی ہے۔

حصۂ نظم میں دو نئی آوازیں خاص توجہ کی مستحق ہیں۔ شفیق فاطمہ شعری کی چند ایک چیزیں اِدھر اُدھر شائع بھی ہو چکی ہیں۔ لیکن محمود سعید پہلی بار روشناس ہوئے ہیں۔

کتابوں پر ریویو کے حصہ میں عام روش سے ہٹ کر تفصیلی تبصرے کرائے گئے ہیں۔ اس خصوصیت کو ہمیشہ برقرار رکھا جائے گا۔ ڈاکٹر محمد حسن کا تبصرہ، ن۔م راشد اور آزاد نظم پر ایک مبسوط مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔

اختتاماً مجھے "سوغات" کے متعلق صرف اتنا کہنا ہے کہ یہ پرچہ کسی تجارتی مفاد کے پیش نظر نہیں نکالا گیا ہے اور نہ اس کا مدیر کوئی کاروباری ناشر۔ اس کے ذریعہ ادب یا ملک و ملت کی خدمت کا بھی مجھے کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ "اصلاحِ معاشرہ" یا "خدمتِ قوم" سے کہیں زیادہ خود اپنے ذوق کی تسکین کے لئے اس پرچہ کا اجراء ہو رہا ہے۔ اب اگر ضمناً ایسا ہو گیا کہ ادب کا اچھا مذاق رکھنے والے دیگر حضرات کو بھی اپنی تسکین کا سامان اس میں مل جائے۔ اور وہ اس پرچہ کے وجود اور بقا کو ضروری سمجھیں اور میرا ہاتھ بٹائیں تو میں ان کا ممنون ہوں گا اور پھر شاید "سوغات" سہ ماہی سے دو ماہی بھی ہو جائے۔

محمود ایاز

جے۔ بی۔ پریسٹلے

ادیب کا مستقبل

مجھے اعتراف کر لینے دیجئے کہ اپنے دوسرے معاصرین کے مقابلے میں مجھے ادیب کا مستقبل زیادہ تاریک نظر آتا ہے۔ یہ بات میں محض ذاتی تجربے کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں اس وضاحت کی ضرورت اس لئے محسوس ہو رہی ہے کہ آج کل عام طور پر فرض کر لیا جاتا ہے کہ ادیب ہر بات ذاتی نقطۂ نظر سے کہتے ہیں اور معروضیت برتنے کی کوشش نہیں کرتے۔ مجھ پر یہ تلخ تجربہ بھی گذرا ہے کہ لوگوں نے میرے چند بُرے کرداروں کے کہے ہوئے جملوں کو میرے خیالات سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ذاتی تجربے کے ناگزیر ہونے سے مجھے انکار نہیں۔ لیکن آدمی اپنے آپ سے الگ ہو کر سوچنے کی کم از کم کوشش تو ضرور کر سکتا ہے۔ اگر میں ادیب کے مستقبل کے بارے میں مایوس ہوں تو ممکن ہے اس کی وجہ وہ حوصلہ شکن حقائق ہوں جو میرے پیش نظر ہیں۔ جو ادیب اس بارے میں زیادہ پُر امید ہیں ہو سکتا ہے وہ مجھ سے زیادہ عقلمند ہوں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں سے چند ایک اکثر لوگوں کی طرح ناخوشگوار حقائق سے منہ چھپانا چاہتے ہوں۔ ہم سب کو کسی نہ کسی حد تک تلخ حقائق سے چشم پوشی کرنی پڑتی ہے۔ اور یہ زندگی کی ضروریات کا تقاضا بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اپنے پیشے کے بارے میں ایک حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرنے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ لکھنے لکھانے کا پیشہ اپنی اہمیت کھوتا جا رہا ہے۔ آج ادیب کا درجہ وہ نہیں رہا جو پہلے تھا۔ آج معاشرے میں اسے کوئی خاص توقیر کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ ممکن ہے آج خود ادیب وہ نہ رہے ہوں جو پہلے تھے۔ یہ بڑی آسان دلیل ہے اور عام طور پر اسے بطور جواز پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ کوئی شافی جواب نہیں ہے۔ ہم آج کل کے ادیب اول درجہ کے مجرم سہی لیکن اگر ہم میں ابتدائی وکٹورین عہد کے ڈکنس سے بڑا جینئس ناول نگار بھی

پیدا ہو جائے تو وہ آج عوام میں ڈکنس کی مقبولیت نہیں حاصل کر سکتا۔ اس ناکامیابی کی کئی وجوہات ہیں۔ آج ایک لکھنے والے کی مقبولیت کے راستے میں صرف اس کے معاصرین کی کتابیں ہی نہیں بلکہ ان کے علاوہ اسے ٹیلی وژن، ریڈیو اور فلموں سے بھی شدید مسابقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آج لوگوں کے پاس ریڈیو اور فلم وغیرہ کی تفریحات کے بعد اتنا وقت باقی نہیں رہتا کہ ادب کی مقبولیت کی نذر ہو سکے۔ قارئین کا موجودہ طبقہ آج کل کے ادیبوں سے وکٹوریائی عہد کے قارئین کی طرح تعاون نہیں کرتا۔ (یہ ہمیشہ سے میرا خیال رہا ہے کہ فنونِ لطیفہ کی ہر صنف پر عوامی ضروریات کی شدت فوری طور پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ثبوت کے طور پر الزبتھ دور کا ڈرامہ، انیسویں صدی کا ناول اور ۱۹۲۵ — ۱۹۱۰ء میں خاموش فلموں کی حیرت انگیز ترقی کو پیش کیا جا سکتا ہے) وکٹوریائی عہد تو دور کی بات ہے ہمارے عوام آج ادیبوں کو اتنا بھی تعاون نہیں دے رہے ہیں جتنا انہیں ۱۹۳۰ – ۱۹۲۰ء کے عوام سے مل جاتا تھا۔ موجودہ دور میں کوئی ادیب ڈکنس کی شہرت نہیں حاصل کر سکتا کیونکہ موجودہ پبلک کسی کو یہ شہرت دینا نہیں چاہتی۔ گذشتہ دس سال میں نئی کتابوں کا انبار لگ گیا ہے لیکن ان نئے لکھنے والوں میں سے کتنے نام ایسے ہیں جو آج زبان زد خاص و عام بن چکے ہیں۔ ہمارے ہاں جنگ کے بعد کئی سماجی شخصیتیں ابھری ہیں مگر ان شخصیتوں میں مصنفین کی تعداد کتنی ہے؟

میری جوانی کے زمانہ میں جو لوگ مشہور و معروف ادیبوں کو پڑھتے نہیں تھے اور جنہیں ادب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایسے لوگ بھی کم از کم ادیبوں سے واقفیت ضرور رکھتے تھے کیونکہ وہ ادب کے نمائندے تھے اور ادب ابھی اتنی اہمیت رکھتا تھا کہ اس کی نمائندگی قابلِ وقعت سمجھی جاتی تھی اور کوئی تیس یا چالیس سال پیچھے جائیے تو یہ فرق اور نمایاں نظر آئے گا۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اور ٹینی سن کا شاعروں کی حیثیت سے نہیں بلکہ سماجی شخصیتوں کے طور پر موازنہ کیجئے۔ اس زمانے میں گلاڈسٹون کے مقابلہ میں ٹینی سن کی جو سماجی حیثیت تھی وہ آج چرچل کے مقابلہ میں ایلیٹ کی نہیں ہے۔ ٹینی سن کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے لوگ دور دراز سے آتے تھے۔ آج حمل و نقل کی آسانیاں نسبتاً زیادہ ہیں۔ لیکن کبھی ہم نے یہ نہیں سنا کہ ایلیٹ کو دیکھنے کے لئے لوگ "CHELSEA" کا سفر کرتے ہوں۔ ہو سکتا ہے ٹینی سن کے ذہین اور سخن شناس پڑھنے والوں کی تعداد ایلیٹ سے زیادہ نہ ہو۔ ٹینی سن نے یقیناً عوامی مذاق کا کافی خیال رکھا لیکن "کاک ٹیل پارٹی" اور

"The Confidential clerk" کے مصنف کو بھی شکل ہی سے بہت زیادہ خشک یا سنجیدہ کہا جا سکتا ہے۔ حالانکہ یہ بات ٹینی سن کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود عوام کی نظروں میں ٹینی سن کی ادبی شخصیت ادیب کے مقابلہ میں بدرجہا بلند تر تھی کیونکہ ادب بذاتِ خود اس زمانہ میں بہت زیادہ اہم اور بلند متصور ہوتا تھا۔ ہمارے بزرگ ادب کا جشن مناتے تھے مگر اب ادب سے ہمارا تعلق محض برائے نام رہ گیا ہے۔ سرکاری اور سماجی حلقوں کی تقریبات اور اعزازات کی دنیا میں ادب کے لئے اشک شوئی کے طور پر چند زبانی ہمدردی کے کلمات نکالے جاتے ہیں۔ اور ہماری قومی شخصیتیں ادب کے مطالعہ سے زیادہ گھوڑ دوڑ میں دلچسپی لے رہی ہیں۔

خود میرے دیکھتے دیکھتے ادیبوں کے ساتھ ہمارے بیشتر ناشرین کا رویہ بدل چکا ہے۔ پرانے ناشرین کو جن لکھنے والوں کی اہلیت پر اعتماد ہوتا تھا ان کا وہ سالہا سال تک اس امید پر ساتھ دیتے تھے کہ جب بھی ادیب کوئی کارنامے کی تخلیق کریگا تو وہ اس کی کامیابی میں شریک ہو جائینگے۔ وہ کتابوں کے انفرادی معیار پر نہیں بلکہ لکھنے والوں کے معیار پر جاتے تھے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس قسم کے ناشرین آج کمیاب ہیں۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کی تعداد روز بدن کم سے کم تر ہوتی جا رہی ہے۔ اشاعتِ کتب کے کاروبار کی تلخ اقتصادیات نے مقبولِ عام ہونے والی کتابوں کی مانگ اس قدر بڑھادی ہے کہ لکھنے والوں کی اہمیت ثانوی حیثیت اختیار کر گئی ہے اور اب کسی جوہرِ قابل کو نشو و نما پانے کے مواقع فراہم کرنا بڑا مشکل اور مہنگا سودا ہو گیا ہے۔ آج ہمارے یہاں بڑے بڑے اشاعت گھروں میں تجارتی بنیادوں پر کتابوں کی عام پیداوار ہو رہی ہے۔ خاص طور پر امریکی ناشرین کے لئے ادیبوں کا وجود کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتا۔ ان کے نزدیک لکھنے والوں کی اگر کوئی اہمیت ہے تو صرف کتابوں کے نام فراہم کرنے کی حد تک۔ کاغذی جلد کی کتابوں کی تجارتی پیداوار نے اس صورتِ حال کو اور تقویت دی ہے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ان کتابوں کے اشاعتی اخراجات کا جس وقت تخمینہ بنایا جاتا ہے اس وقت ادیبوں کا حساب ہی نہیں کیا جاتا بلکہ آخری لمحے میں لکھنے والے کی رائلٹی کے لئے ایک حقیر رقم کی شکل سے مار کوٹ کر گنجائش نکالی جاتی ہے۔ ان اشاعت گھروں میں کتابوں کے نام ہی سب کچھ ہیں اور لکھنے والے قطعاً ناقابلِ اعتنا۔ یہاں بھی اب فلمی اسٹوڈیوز کی پیروی شروع ہو چکی ہے۔ جہاں لکھنے والوں کو تخلیقی فن کار نہیں بلکہ دیگر درمیانی درجے کے تکنیک کاروں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے اور جن کی حیثیت پروڈیوسروں، ڈائرکٹروں اور

اداکاروں سے بدرجہا کمتر سمجھی جاتی ہے۔ فلم، ٹیلی وژن یا ریڈیو میں کام کئے ہوئے تجربہ کار ادیب ہمارے ان نئے ناشرین میں سے بآسانی مانوس ہو جاتے ہیں جو لکھنے والوں کے نام سے زیادہ کتاب کے نام اور انفرادیت اور شخصیت کی بجائے بازار میں جلد بکنے والے سامان کے خواہاں ہوتے ہیں۔

جو ادیب تخلیقی فن کار کی بجائے ایک اعلیٰ درجہ کے تکنک کار کی حیثیت کو صبر و شکر کے ساتھ قبول کر سکیں، اپنی تسکین کو نظر انداز کر کے دوسروں کو خوش کرنے کے لئے محنت کر سکیں حکومت، پولیس یا مختلف صنعتوں کے متنظمین کو بدظن نہ ہونے دیں، ان ادیبوں کے لئے اس میدان میں کافی مواقع ہیں۔ لیکن اتنا سب کچھ قربان کرنے کے بعد بھی مستقبل کے امکانات زیادہ روشن نہیں ہیں۔ اگر ادیب یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ان شعبوں میں کام کرنے کے بعد اس قدر رقم پس انداز کر لیں گے کہ آرام سے اپنے شہکاروں کی تخلیق کر سکیں تو وہ غلطی پر ہیں۔ یہ شعبے سونے کی کانیں نہیں ہیں۔ لاکھوں آدمیوں کے لئے ٹیلی وژن کے پروگرام لکھکر ادیب کو جو معاوضہ ملتا ہے وہ کسی معمولی جریدے یا تھیٹریکل کمپنی کے معاوضے سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اگر ادیب قلیل معاوضے کی شکایت کرتا ہے تو ٹیلی وژن والے جواب دیتے ہیں کہ آخر ادیب کو اتنی شہرت بھی تو مل رہی ہے۔ لیکن اس شہرت کا مصرف کیا ہے؟ اگر ادیب ڈرامہ نگار ہے تو اس امید میں تھیٹریکل کمپنیوں کا رخ کرتا ہے کہ وہ اس کی کفالت کریں گی۔ لیکن ٹیلی وژن کی ناجائز مسابقت نے ان کمپنیوں کو اتنا شدید نقصان پہنچایا ہے کہ اب یہاں بھی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ بی بی سی (B. B. C) والے ادیبوں کو نہ صرف کم سے کم رقم دیتے ہیں بلکہ اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ادیبوں کی اجرتوں پر پابندی قائم کرنے کے لئے وہ ٹیلی وژن کے تجارتی اداروں کے ساتھ معاہدہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ حالت دیکھکر بعض اوقات میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ سب کچھ واقعی اقتصادی نقطۂ نظر سے کیا جا رہا ہے؟ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاست دانوں کی طرح حکام بھی مصنفین سے نفرت کرتے ہیں۔

یہاں پہنچ کر شاید کچھ قارئین یہ محسوس کریں گے کہ میں ادب سے بہت دور نکل گیا ہوں۔ لیکن میں عرض کروں گا کہ غیر متوقع مقامات سے ظاہر ہو کر بدحواس کر دینے کا کرشمہ ادب کا پرانا شعار رہا ہے۔ جہاں نیک نیت اور تندہی سے کام کرنے والے خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں وہاں

بعض اوقات معمولی قسم کے مجرد ادبی شہ پارے تخلیق کر لیتے ہیں۔ درحقیقت اچھا ادب تحریروں کے ایک انبار سے نمودار ہوتا ہے۔ لیکن سنبھل کر لکھنے والے ناول نگار، محتاط نقادوں اور مضمون نگاروں کا معاملہ مختلف ہے۔ اگر یہ لوگ ادب کو بطور پیشہ اختیار کرنا چاہیں تو بہت بڑی غلطی ہوگی۔ ان کے لئے بہترین صورت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ کسی ایسے مستقل اور آسان کام کی تلاش کریں جس کا ادب سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔ صحافت نگاری، اشتہار بازی یا پمفلٹ نویسی کے شعبے بظاہر ادیب کے لئے موزوں معلوم ہوتے ہیں لیکن درحقیقت یہ ایسے پھندے ہیں جن سے بہت کم ادیب بچ کر نکل سکتے ہیں۔ اس کے بجائے کسی چھوٹے سے شہر کے سکون پرور ماحول میں دفتری ملازمت زیادہ موزوں ہے۔ اس قسم کی ملازمت ادیب کا بہت زیادہ وقت نہیں لے گی۔ اور ملازمت کے اوقات کے بعد تخلیقی کام کے لئے ادیب کے پاس کافی وقت بچ رہے گا۔ ادیب کے لئے چند ملازمتوں کو مخصوص کر دینا چاہئیے۔ میونسپالٹی کے حکام کو اپنے دفتروں میں کم از کم ایک ادیب، شاعر اور نقاد کو ملازمت دینے پر آمادہ کرنا چاہئیے۔ اک زمانے میں، یونیورسٹیوں (ادبی مزاج کے لئے خصوصاً نقادوں کے لئے) بہت موزوں خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن آج طالب علموں کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے۔ اور پروفیسروں کو اتنے لکچر دینے پڑتے ہیں کہ یونیورسٹی کا علمی ماحول بھی آج مناسب اور موزوں نہیں رہا۔ کسی شہر میں ایک چھوٹی موٹی دکان اور کسی مذہبی قسم کی بیوہ کے گھر میں (جس کی جوان لڑکیاں نہ ہوں) کرایہ پر رہنے کا کمرہ بے لاگ ادب کی تخلیق کے لئے بہترین ماحول فراہم کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ وظیفوں اور امدادی رقوم سے نقاد اور مورخ کی کافی مدد ہو سکتی ہے امریکہ میں آج وہاں کے موجودہ ادب پر ٹھوس اور اعلیٰ درجہ کا تنقیدی سرمایہ موجود ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہاں الفرڈ کازن اور Maxwell geisman جیسے امریکی نقادوں کو بڑے بڑے وظیفے ملتے ہیں اور وہ جم کر یکسوئی کے ساتھ کام کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس ہمارے ہاں لکھنے والوں کو تبصرے اور اخباری مضامین لکھ کر اپنی روزی کمانی پڑتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں امریکہ کی طرح وافر سرمایہ رکھنے والے بڑے بڑے ادارے بھی تو موجود نہیں ہیں۔ جنگ کے فوراً بعد ادیبوں کو امداد دینے کی مختلف اسکیمیں بنائی گئیں۔ لیکن ان کا کوئی عملی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس قسم کے سرکاری ماحول میں تخلیقی فن کار

پنپ بھی نہیں سکتے۔ کیونکہ امداد دینے والی کمیٹیوں کی نظر میں تخلیقی فن کار اپنی شراب نوشی، خود پسندی اور عجیب و غریب خیالات کی بنا پر کوئی اچھا آدمی نہیں سمجھا جاتا اور ادیب فنونِ لطیفہ سے متنفر اخباری دنیا کو اس طرح بدظن کر لیتے ہیں کہ کمیٹیوں کے سہ ماہی جلسوں میں اراکین کو ادیبوں کی پشت پناہی کرنی مشکل ہو جاتی ہے۔ مزید برآں انفرادیت پسند اور آزاد خیال ادیب خود اس طرح وظیفوں پر گذارہ کرنا پسند نہیں کرتا کیونکہ وہ سرکاری دنیا کی مصلحتوں سے سمجھوتے نہیں کر سکتا۔ وہ یہ محسوس کرنا چاہتا ہے کہ صرف اس کی اپنی تخلیقات اسے شہرت اور روزگار مہیا کر رہی ہیں۔ دراصل ثقافتی کارروائیوں کے اخراجات پر جو انکم ٹیکس لگایا جاتا ہے اگر اس کا ایک قلیل حصہ بھی فنونِ لطیفہ کے لئے خرچ ہو سکے تو جو نتائج برآمد ہوں گے وہ امدادی وظیفوں یا موجودہ آرٹ کونسل سے دس گنا بڑے اداروں سے بھی ظہور پذیر نہیں ہو سکتے۔

پیچ پسند اور جوہر پر رکھنے والے ادیب خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے عام طور پر سماج کی مروجہ اقدار سے انحراف کرتے ہیں۔ اس قسم کے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کون کر سکتا ہے؟ وزارتیں، کابینہ اور کارپوریشن جن نیک آدمیوں سے بھری ہوئی ہیں ان سے تو یہ امید نہیں کی جا سکتی۔ قارئین کے مذاق کو مدنظر رکھنے والا پریس یا بڑی تجارتوں کے مشتہرین اور تعمیری کمپنیوں کے منیجروں سے بھی یہ امید بیکار ہے کہ وہ سر پھرے لکھنے والوں کی پشت پناہی کریں گے۔ اس صورتِ حال میں ایک ادیب کے لئے لے دے کے یہی ایک چارہ کار رہ جاتا ہے کہ وہ صلاحیت اور جوہر کو پرکھنے والے چند ایک، باقی ماندہ حوصلہ مند ناشرین کا سہارا لے اور ایسے قارئین کی بڑھتی ہوئی تعداد پر تکیہ کرے جن میں کتابیں خریدنے کی استطاعت ہے اور جن کا ذوق موجودہ عامیانہ ادبی رجحانات سے مجروح نہیں ہوا ہے۔ اس قسم کے ادیب کے لئے عقل و ہوش کا تقاضا یہی ہے کہ وہ کوئی ایسی غیر ادبی ملازمت اور تجارت میں لگ جائے جس سے وہ اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی کم از کم بنیادی ضروریات کی تکمیل کر سکے لیکن آجکل اوسط درجہ کی آمدنی میں ادبی کام کے لئے ایک الگ کمرہ اور دیگر سہولتوں کا حصول مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے، لیکن جس قسم کے ادیب کا ہم تصور کر رہے ہیں وہ عموماً عقل و ہوش سے بیگانہ ہوتا ہے اور شاید یہی کمزوری اس کی طاقت بھی ہے۔ وہ تخلیقی کام کے ساتھ ساتھ کوئی کاروباری کام کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اگر اول تا آخر ادیب نہیں

ہے تو پھر کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ اپنی صلاحیتوں کو خانوں میں نہیں بانٹ سکتا۔ تخلیقی لگن مکمل توجہ اور انہماک کی طلبگار ہوتی ہے۔ تخلیق کا فن بذاتِ خود ایک طرزِ حیات ہے۔ یہ فوٹوگرافی یا اسٹامپ جمع کرنے کا شوق نہیں جو دوسرے کاموں کے ساتھ ساتھ جاری رہے۔ ادیب اگر سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر اپنے آپ کو مکمل طور پر ادب کے لئے وقف نہیں کر سکتا تو پھر اس کے لئے عزتِ نفس کا سوال بھی باقی نہیں رہتا۔ ادیب محسوس کرتا ہے کہ اس کا وجود عبارت ہے تخلیق سے۔ اسے یا تو کچھ تخلیق کرنا ہے یا پھر خود ختم ہو جانا ہے اور ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ ہمیں ایسے ہی فن اور فن کار کی ضرورت ہے۔ ہمیں اس قسم کے ادیب زیادہ تعداد میں چاہئیں۔ یہ لوگ اپنی زندگیاں کسی نہ کسی طرح گذار ہی لیتے ہیں لیکن اس امر سے انکار نہیں کہ ان کی راہ میں جو مشکلات آج حائل ہیں وہ پہلے نہیں تھیں۔ اور ان حقائق کی بنا پر ادیب کے مستقبل سے میری مایوسی حق بجانب ہے۔ لیکن مجھے اعتراف ہے کہ اگر کوئی اس صورتِ حال کو غلط ثابت کرے تو مجھے بے حد خوشی ہو گی۔

(ترجمہ: محمود ایاز)

ممتاز شیریں

کے

تنقیدی مضامین کا مجموعہ

"ممتاز شیریں ہمارے ادب میں کئی لحاظ سے بڑی اہم اور ممتاز شخصیت کی مالک ہیں۔ انہوں نے ادب کو مختلف پہلوؤں سے پرکھا، جانچا اور پیش کیا ہے۔ ان کی فکر میں گہرائی، ان کے مطالعہ میں گیرائی اور ان کے قلم میں جان ہے ان کا ذوقِ ادب اردو میں بڑے اعتبار کی چیز ہے۔"

مجتبیٰ حسین

معیار

ناشر

نیا ادارہ، لاہور

محمد حسن عسکری

ادب پرور اقلیت

آج کل دنیا میں ہر شخص کسی نہ کسی فکر میں مبتلا ہے۔ کسی کو روٹی کپڑے کی پریشانی ہے، کسی کو معیارِ زندگی کی مصیبت۔ کسی کو ہائیڈروجن بم کا خوف ہے تو کسی کو امن اور جنگ کی اُلجھن۔ غرض ہم سب کے سب شہر کے اندیشوں میں دبلے ہوتے جا رہے ہیں۔ خیر، یہ تو بڑے مسائل ہیں جن سے نسلِ انسانی کی حیاتیاتی بقا کا سوال وابستہ ہے۔ لیکن ایک چھوٹا سا مسئلہ اور بھی ہے، جو ایک معمولی اور بے اثر سی اقلیت کو پریشان کرتا ہے۔ اس اقلیت کا اندازہ یہ ہے کہ دنیا کے زیادہ تر لوگ تہذیبی سرگرمیوں اور خصوصاً ادب سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔ سائنس کے سامنے ادب کا چراغ کہاں جل سکتا ہے؟ اور اگر اس کا امکان ہو بھی تو فلم اور ٹیلی وژن کے سامنے ادب کو کون پوچھتا ہے۔ کیونکہ اب تک منجملہ اور باتوں کے ادب تفریح کا ایک ذریعہ بھی رہا ہے۔ لیکن اب تفریح کے آسان تر ذرائع نکل آئے ہیں، جن میں ادب کی سی معنویت نہ سہی، مگر عام لوگوں کے لئے دل لگی کا سامان زیادہ ہے۔ چنانچہ ادب نہ تو علم کا ذریعہ باقی رہا ہے۔ اور نہ تفریح کا۔ ایک جگہ سائنس نے چھین لی، دوسری جگہ فلم نے۔ لہٰذا اس دنیا میں ادب کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

پھر اس اقلیت کے اندر ایک چھوٹا سا گروہ اور ہے جس کا ایمان ہے کہ ادب صرف انسانیت کے ساتھ مر سکتا ہے، یا جو کم سے کم اتنا چاہتا ہے کہ ادب نہ مرے۔ ساتھ ہی اس گروہ کو یہ بھی دکھائی دے رہا ہے کہ فی الحال دنیا ادب کی موت اور زندگی کے سوال سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔ چنانچہ اس گروہ کے لئے بس اتنی امید باقی رہ گئی ہے کہ جس اقلیت کے دل میں ادب کی قدر ہے وہ اسے زندہ رکھنے کی کوشش کرے۔

مغرب کے زیادہ تر دانش ور اپنی ذہنی جد و جہد سے تھک کے یہی کہنے لگے ہیں، اور مشرق کے بھی بہت سے دانش ور اُن کی تقلید میں یہی سوچنے پر مجبور ہیں۔

تو گویا فیصلہ یہ ہوا کہ اگر ادب زندہ رہے گا تو صرف ایک چھوٹی سی اقلیت کی بے لاگ محبت کے سہارے۔

اگر ہمارے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ اقلیت ادب کو زندہ رکھ بھی سکتی ہے یا نہیں تو اس پر غور کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایسی ادب پرور اقلیت کے موجودہ طرزِ عمل کو دیکھیں۔ چونکہ یہ خیال مغرب سے چلا ہے۔

چلاہے۔ اس لئے مثال کے طور پر مغرب ہی کے ادیبوں کو لیتے ہیں۔

اس وقت مغرب میں دو قسم کا ادب پیدا ہو رہا ہے۔ ایک طرف تو وہ ادیب ہیں جو مثبت رویہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ بالارادہ اور بڑے تجسس کے ساتھ نشاطیہ رنگ میں لکھتے ہیں۔ لیکن انہیں خود اپنی آواز کھوکھلی محسوس ہوتی ہے۔ دوسری جنگ کے بعد فرانس میں "نئی شاعری" کا بڑا چرچا تھا، لیکن آٹھ دس سال کے اندر اندر پتہ چل گیا کہ دعوے صرف دماغ سے برآمد ہو رہے تھے، دل سے نہیں۔

دوسری طرف وہ ادیب ہیں جو زندگی کو حسن اور معنویت سے خالی دیکھتے ہیں۔ یا کم سے کم جن کی تحریریں پڑھ کر یہی احساس ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے ادیب نسبتاً زیادہ گہرائی سے بولتے ہیں۔ مگر مغربی ادب میں یہ کام سو سال سے ہو رہا ہے، اور اس قسم کا ادب صرف اعادہ کر رہا ہے۔ اضافہ نہیں۔ یہ سلسلہ بھی کتنے دن چل سکتا ہے؟

چنانچہ مغرب میں جو اقلیت ادب کو زندہ رکھنے کا فرض اپنے ذمے لیتی ہے اس کے بس کا یہ کام معلوم نہیں ہوتا۔ آخر اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ جب تک پورے معاشرے کے اندرونی محرکات اور مطالبات ادب پر ور اقلیت کی پشت پناہی نہ کر رہے ہوں، ادب کی زندگی مشکل ہے۔ ادب کا احیاء اور انسانی زندگی کی تشکیل نو، یہ دو چیزیں ساتھ ہی ساتھ چلیں گی۔ مخلص سے مخلص اقلیت بھی اپنے خلوص کے سہارے ادب کو زندہ نہیں رکھ سکتی۔ یہ کام تو پورا معاشرہ ہی کرتا ہے جس کا آج مطلب ہے پوری انسانیت۔

ھنری مِلر

"امریکی ادب ——— جو مر چکا ہے"

میرے حالیہ دورۂ یورپ میں جس چیز نے مجھے بے حد متاثر کیا وہ مختلف النوع بلند پایہ کتابیں ہیں جو ہر جگہ بکثرت اور نمایاں نظر آ رہی تھیں۔ کاغذی گرد وپوش کی ان کتابوں کو دیکھ کر ایک طمانیت کا احساس ہوتا تھا۔ ان کتابوں کے عنوانات اور مصنفین اور ناشرین کے نام ہی سر ورق کو دلکش اور جاذب توجہ بنانے کے لئے کافی تھے۔ ان کے مقابلہ میں امریکی کتابوں کی شوخ اور چیختے ہوئے رنگوں کی جلدیں ذوق سلیم کے لئے کتنی گراں اور بیزار کن ثابت ہوتی ہیں۔ ان سطور کے لکھتے وقت مجھے کوئی ایک ہزار یا اس سے کچھ زائد کتابوں کی پشتیں نظر آ رہی ہیں، جو میری مختصر لائبریری کا سرمایہ ہیں۔ انہی کتابوں میں بھی بیرونی مطبوعات اپنی اسی استواری، سادگی اور اصلیت کی وجہ سے نمایاں نظر آتی ہیں جو اہل یورپ اور امریکی باشندوں کا مابہ الامتیاز ہے۔ سیاسی یا کسی اور دائرۂ عمل کی طرح اشاعت کتب کے کاروبار میں بھی، ہر قوم کے چند خصوصی اوصاف کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً سویڈن کی کوئی کتاب کھولئے، ورق الٹتے ہی آپ کو عمدہ سفید کاغذ، پاک صاف اور دلکش حروف اور سویڈنی رسم الخط میں مستعمل علامات سے سجے ہوئے ٹائپ ملیں گے۔ کوئی شخص بھول کر بھی جرمنی اور اطالیہ میں چھپی ہوئی کتابوں پر ایک دوسرے کا دھوکہ نہیں کھا سکتا۔ جہاں تک ڈی لو (DE-LUXE) ایڈیشنوں کا تعلق ہے بیرونی مطبوعات امریکی کتابوں سے کہیں زیادہ شاندار ہوتی ہیں۔ یہی فرق امریکہ اور فرانس کے بہترین کمپوان میں یا CLARIDGE اور CRILLION کے کمروں اور MANHATTAN کے کسی بھی ہوٹل کے کمروں کے درمیان نظر آئے گا (MANHATTAN میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوائے بنگلے ہوٹلوں کے یہاں اور کچھ ہے ہی نہیں)

جب بھی مجھے GUILDE-DU-LIVRE کی ماہانہ اشاعت مل جاتی ہے میرا دل مسرت سے باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اگر مجھے ہر مضمون کا مطالعہ کرنے کی فرصت بھی نہ ملے تو

اس رسالہ کی صرف ورق گردانی مجھ میں زندگی کی ایسی لہر اور ولولہ پیدا کر دیتی ہے جو امریکہ کی کسی اشاعت سے ممکن نہیں۔ میرے ان تاثرات کی کئی توجیہات ہو سکتی ہیں۔ لیکن میری دانست میں سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ کسی کتاب یا مصنف پر ایک یورپین اہل قلم کی لکھی ہوئی تحریر سے مجھے کبھی اکتاہٹ یا تھکن نہیں محسوس ہوتی۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ادبی موضوعات کا سرمایہ کبھی کا ختم ہو چکا ہے۔ میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ اب کتابوں یا ان کے تحقیق کاروں سے کوئی حقیقی جاندار اور مستقل دلچسپی باقی نہیں رہی۔ اور جو چند لوگ اس آگ کو روشن رکھنے کے لئے نئے حقائق اور اعداد و شمار یا چونکا دینے والی چیزوں کی تلاش میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں میں انہیں ادب کے شیدائی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ ان کے پاس مطالعہ کی وسعت، تجربات کی زرخیزی اور یادوں کا سرمایہ ہے نہ کہنے کے لئے کوئی طبعزاد بات۔

ان لوگوں میں مختلف ادوار اور زبانوں میں لکھی ہوئی کتابوں یا ان کے مصنفین سے مقابلہ و موازنہ کرنے کی بھی اہلیت نہیں۔ ان کے متعلق کبھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ انہیں کسی بڑے ادیب یا کم از کم ممتاز ادیب سے کوئی گہرا لگاؤ رہا ہے۔ لیکن اس کے باوصف وہ اپنی ہمہ دانی کے زعم میں اپنے موضوع پر قلم اٹھانے سے نہیں جھجکتے۔ میری دانست میں اس قسم کی تحریرات پرنالے کے گندے پانی سے مماثلت رکھتی ہیں۔ خصوصاً ہمارے ان عالم و فاضل لکھنے والوں کے ہاں تو یہ گندگی اور متعفن ہو جاتی ہے جو دیمک کی طرح کتابوں کو اس طرح چاٹ جاتے ہیں کہ بالآخر ادب اور انسان دونوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

یورپ میں مجھے جہاں کہیں بھی جانے کا اتفاق ہوا خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا شہر کیوں نہ رہا ہو کسی نہ کسی کتاب گھر کے آگے میرے قدم خود بخود رک جاتے تھے۔ اور میں پورے جوش و انہماک سے نئی پرانی کتابوں اور ان کے ناموں کو دیکھتا کھڑا رہ جاتا۔ اس کے برعکس امریکہ میں چلتے چلتے ایک اچھلتی ہوئی نظر یہ جاننے کے لئے کافی ہے کہ ان کتابوں میں کوئی چیز مجھے متوجہ کرنے والی نہیں۔ امریکی کتب گھروں کے سامنے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساری کتابیں سارے رسائل پر قابل طباعت چیز حتیٰ کہ لغت اور تک سب سانچے میں ڈھلے ہوئے ایک ہی مشینی ذہن کی پیداوار ہیں۔ اور ایک بد ذوق تخیل سے بے بہرہ ناقابل یقین عفریت کے شہکار ہیں۔ کسی بھی موضوع پر خواہ وہ سائنس ہو یا فلسفہ، افسانہ ہو یا تاریخ کوئی بھی کتاب اٹھا لیجئے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کھوکھلے اور بے معنی الفاظ کا ایک ڈھیر جمع کر دیا گیا ہے فکر و بیان میں کہیں تنظیم اور تسلسل کا پتہ نہیں چلتا۔

اس میں شک نہیں کہ میں کسی قدر مبالغے سے کام لے رہا ہوں۔ مجھے اور میری طرح ہر شائستہ ذہن کو اعتراف ہے کہ پچھلے سو پچاس سال کے دوران میں امریکہ سے بھی چند ایک اچھی کتابیں نکلی ہیں۔ تاہم میں اس خیال پر مصر ہوں کہ ہمارے ادب میں ایک عام انحطاط پیدا ہو چکا ہے۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف پچھلے پانچ دس سال پر ہی نظر دوڑائیے۔ اور ہمارے اور یورپین اہلِ قلم کی ادبی تخلیق کا موازنہ کیجئے تو پتہ لگیگا کہ میں اندھیرے میں تیر نہیں چلا رہا ہوں۔ تلخ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم نے عوام کو پڑھا لکھا بنانے کی کوشش میں تخلیقی فنکاروں کو قدر دانوں سے محروم کر دیا ہے۔ جو لوگ زیادہ سے زیادہ کتابوں کو عوام تک پہنچانے میں سرگرم کار ہیں انہیں دراصل ادب سے یک گونہ بیر ہے۔ وہ یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہر وہ شخص جس کا ادبی مطالعہ کم یا نہ ہونے کے برابر ہے ــ اور ہماری آبادی کا بہت بڑا حصہ اس قسم کے لوگوں پر مشتمل ہے ــ وہ ان جیسی کتابوں کو پڑھ کر حقیقی ادب کا ذوق پیدا کرے گا۔ یہ سراسر جھوٹ ہے۔ اچھے ادب کا ذوق اچھے ادب کے مطالعہ سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ لغطی معموں یا متبذل مضامین کے مطالعے سے نہیں۔ ماضی میں ہمارے بچے کم از کم انجیل کی زبان سے واقف تھے۔ اگرچہ ان کا مطالعہ محدود تھا۔ تاہم جو چند کتابیں انہیں مہیا کی جاتی تھیں۔ ان کے مطالعے سے اذہان پر ناخوشگوار اثرات مرتب نہیں ہوتے تھے۔ لیکن آج کل نوجوانوں کے آگے جو چیز پیش کی جا رہی ہے۔ اس کو دیکھ کر میں تو لرز اٹھتا ہوں۔ خصوصاً ہمارے ... فوجی فرصت کے اوقات میں جس قسم کی چیزوں کا مطالعہ کرتے ہیں وہ تو اور بھی ہولناک معلوم ہوتا ہے۔ لیکن شاید فاقہ کش لوگ کسی بھی غذا پر زندہ رہ سکتے ہیں!!

آج کل ہماری شاہراہوں کے کنارے خالی ڈبوں اور بوتلوں کے علاوہ پرانے رسائل، کامکس اور جیبی کتابوں کا بھی ایک انبار لگا رہتا ہے۔ مطالعے کے شوقین ــــ عوام کا مبلغ علم بنا ہوا ہے۔ بجلی کی سی تیزی سے پڑھا جانے والا بھوسے کی طرح ہضم ہونے اور فضلہ کی طرح خارج ہو جانے والا یہ مشینی ادب اتنا ہی بے معنی اور مہمل ہے جتنا جد وجہد اور محرومی کو ایک خوفناک شئے سمجھنے والے ہمارے آرام پسند شہریوں کا وہ سامان تعیش جسے انہوں نے لوازمات زندگی شامل کر رکھا ہے۔ اتنی غوغا آرائی۔ اتنی جانفشانی۔ اتنے مصارف اور اتنی اکتا دینے والی یکسانیت کے ساتھ تیار ہو کر بر سرِ عام آنے والا ادب وہی خرافات ہے جو کسی مزید تعارف کا محتاج نہیں۔

حال ہی میں جیبی کتابیں تیار کرنے والی فرم کے ایک اڈیٹر سے دوران گفتگو میں ایک بڑے مزے کی بات مجھ پر منکشف ہوئی۔ جس سے مندرجہ بالا سطور کی تصدیق ہوتی ہے۔ یعنی کسی اشاعت کی غیر فروخت شدہ

کتابوں کو محفوظ رکھنے اور کباڑیوں سے جو کاسی کے جھنجھٹ میں پڑنے کی بجائے ان سے نمٹنے کا سب سے آسان اور سستا طریقہ یہ ہے کہ انہیں نذرِ آتش کر دیا جائے !! یہ طریقہ محکمۂ جنگ کی پالیسی سے کس قدر مشابہ ہے۔ یہ ہے ترقی اور کارکردگی کا امریکی تصور جسے ایک حیران اور ششدر یورپین اسرافِ بیجا سے تعبیر کرے گا۔ یہ ایک خالص تخریبی طریقۂ کار ہے۔ جس سے فنکاروں کی کھلی بے حرمتی ہوتی ہے۔ جب یہ پالیسی عام ہو جائیگی، جو یقینی ہے، تو پھر نہ ادب باقی رہے گا اور نہ کتابیں اور ان کے لکھنے والے۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت اشاعتی کاروبار کے نام سے ایک بڑا ہی کامیاب دھندا چل رہا ہے۔ لیکن ادب یا تخلیقی شخصیات سے اس کو کوئی واسطہ نہیں ہے۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس صورتِ حال کے خلاف احتجاج یا بغاوت کے آثار تک نہیں دکھائی دیتے۔ اس انحطاطی رجحان کو روکنے کے لئے ہمیں ازمنۂ وسطیٰ کی طرف لوٹ جانے کی ضرورت ہے۔ تاکہ ہم پھر مصنفین، ناشرین، اور کتب فروشوں کی تنظیمیں (GUILDS) قائم کر سکیں۔ اور پھر ایسے ادب کی اشاعت کر سکیں جو سب کے لئے نہیں بلکہ چند منتخب افراد کے لئے ہو۔ اور یہ سب کچھ صلہ یا ستائش کی تمنا سے بے نیاز ہو کر کرنا پڑے گا۔

مجھے تو یہ بات صاف نظر آ رہی ہے کہ ہم ایک تباہی کے دہانے پر کھڑے ہوئے ہیں۔ اب اس طوفان کو کوئی معجزہ ہی فرو کر سکتا ہے۔ بلکہ اس معجزہ کے بعد بھی کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ یہ طوفان کیا شکل اور سمت اختیار کرے گا۔ میں ان لوگوں سے ہوں جو معجزات پر یقین رکھتے ہیں۔ کیونکہ میں زندگی بھر ان کا عینی شاہد رہا ہوں۔ معجزوں کے متعلق میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ ناگزیر طور پر وہ اسی وقت رونما ہوتے ہیں جب کہ تمام امیدیں ختم ہو چکی ہوتی ہیں۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ہم اس انتہائی منزل پر پہونچ چکے ہیں۔ کیا یہ باور کرنا مشکل ہے کہ امریکہ اپنے بامِ عروج پر ہونے کے باوجود تباہی سے اس قدر قریب آ گیا ہے ؟ ؟ ہمارے ممتاز مصنفین جو بیرونی نقادوں کی نظر میں امریکہ کے نمائندہ سمجھے جاتے ہیں اور جن کی تصنیفات بالخصوص ترجموں کے لئے منتخب ہوتی ہیں۔ ان سب نے بلا استثنا اپنی تحریرات میں مختلف طریقوں سے ایک عام امریکی آدمی کی ناقابلِ یقین حالتِ زار کی عکاسی ہے۔ اب یہ کس سے پوچھا جائے کہ یہ "عام آدمی" کون اور کہاں کا باسی ہے ؟

پہلے پہل کم از کم بظاہر اس عام امریکی آدمی کے متعلق توقع تھی کہ اس کے آگے اپنی ترقی اور تکمیل کے سنہری مواقع موجود ہیں۔ اور وہ ایک دن وہٹ مین (WHITMAN) کا

جمہوری آدمی بن کر رہے گا۔ مگر آج اس کا کیا حال ہے؟ اگر ہمارے ممتاز ادیبوں کی آنکھوں سے دیکھا جائے تو وہ آج ایک ٹھکرائی ہوئی اور بے بس اور یکہ و تنہا مخلوق نظر آتا ہے۔ اس کے متعلق ایک المیہ کی تخلیق بھی ممکن نہیں۔ کیونکہ اس کی زندگی سے ڈراما ہی ناپید ہے۔ وہ ایک جاندار موضوع کی بجائے بے جان عنوان بن کر رہ گیا ہے۔ ادب کے نام سے وسیع پیمانے پر شائع ہونے والی بازاری.... مطبوعات میں آدمی فارمولاؤں کے ایک بے جان ہندسہ کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اس کی نہ کوئی شخصیت ہے۔ نہ کوئی نام و نشان۔ وہ موجودہ بے روح معاشرے میں ایک کٹھ پتلی کی طرح مریضانہ ذہنیت رکھنے والے پس پردہ ناشرین کے اشاروں پر ناچ رہا ہے۔ دنیا کو تباہی سے بچانے کی دھن میں جیسا کہ اس کے خداوندانِ نعمت اسے باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں، یہ مشینی دماغ کا زائیدہ آدمی خوشی کے ساتھ اپنی ساری انفرادیت کھوتا جا رہا ہے وہ نہ صرف بک چکا ہے۔ بلکہ اس نے اپنا مسکن خالی بھی کر دیا ہے۔ سائنسی افسانہ لکھنے والوں کی طرح جو اپنے خواب و خیال کی دنیا میں اس خطۂ ارضی کو چھوڑ چکے ہیں، وہ بھی ثوابت و سیارے کے چکر میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ اس کی حالت قوتِ ارادی سے کلیتاً محروم خواب میں چلنے والے کی سی ہے۔ سارے ضبط و احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر وہ اس قدر مجہول بن چکا ہے کہ اب اس پر جو بھی شرائط عائد کئے جائیں وہ انہیں قبول کرنے کے لئے تیار ہے اب اس کے لئے آزادانہ عمل و حرکت کی واحد جولانگہ جرائم کی دنیا ہے۔ جو خود فریبی کی آخری منزل ہے

اگر آپ علائم و آثار کے قائل ہیں تو پھر آپ کو صاف نظر آئے گا کہ موجودہ حالات یقینی تباہی کی نشاندہی کر رہے ہیں یا اس اشارہ میں انہیں پرانے مگر حسین نغمات کے لئے ہمہ تن گوش رہوں گا جنہیں اہلِ یورپ نے اپنے دل کے تاروں پر چھیڑ رکھا ہے۔ مجھے ان شاندار اداروں سے شاید مریضانہ دلچسپی پیدا ہو گئی ہے جہاں یورپ کا عظیم الشان کلچر محفوظ ہے۔ غالباً میں اپنے دور کا آدمی نہیں ہوں۔ میں شاید انہیں دقیانوسی یوروپین حضرات کی صحبت کے لئے موزوں ہوں جنہیں اپنی انفرادیت پر ناز ہے۔ اور جو انسان کے مقصد اور اس کے مقام و مآل کی باتیں ایک پر معنی انداز میں کرتے ہیں جن کے لئے زندگی ایک المیہ ہے اور جو اسی المیہ کی بنا پر زندگی کی عظمت اور معنویت کے قائل ہیں۔ غالباً میں حجری دور کے لوگوں سے تعلق رکھتا ہوں جو کتابوں کو ما فوق الادراک قوتوں کا مظہر سمجھتے تھے۔ اور جن کے ہاں تخمین و ظن تلاش حق کا ایک جز ہیں یا شاید میں سحر و ساحری کے اس دور کی پیداوار ہوں۔ جب تخلیق کاروں کو جن میں ادیب بھی شامل ہیں عام آدمیوں

سے بلند اور کسی غیبی طاقت کا آلۂ کار تصور کر کے محبت احترام اور عقیدت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔
مجھے جس چیز نے اہلِ یورپ سے ایک رشتۂ مودت میں منسلک کر رکھا ہے وہ شاید صرف یہ احساس ہے کہ انسانیت کا جذبہ، انسان اور انسان اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ناقابل شکست تعلق قائم کرنے کے لئے کافی ہے۔ جب ادب بے جان مہروں کا کھیل بن جائے تو پھر تخلیق اور تخلیق کار کا وجود باقی نہیں رہتا۔ اور اگر یہ سچ ہے تو پھر ہمیں اپنی اور خود زندگی کی از سرِ نو تعمیر و تشکیل کرنی پڑے گی۔

(ترجمہ:۔ محمد اسمٰعیل تالپتس)

عالمی ادب کے شاہکاروں کی تاریخی دستاویز

ماھنامہ "شاھراہ" دھلی

ناولٹ نمبر

جس کا ادبی حلقوں میں پر جوش خیر مقدم کیا جا رہا ہے شاھراہ کے ناولٹ نمبر میں دنیا بھر
عظیم المرتبت ادیبوں کی زندہ جاوید تخلیقات شامل ہیں۔
ناولٹ نمبر کا ہر ناولٹ شاہراہ ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔
سات سو صفحات کا یہ نمبر ادیبوں اور مترجموں کی تصاویر سے مزین ہے۔ ادیبوں کے
حالات زندگی بھی درج اشاعت ہیں۔

قیمت: سات روپے

جو حضرات فروری ۱۹۵۸ء سے خریداری قبول فرمائیں گے انہیں یہ ناولٹ نمبر مفت پیش کیا جائیگا
ماھنامہ "شاھراہ" کا سالانہ چندہ:۔ دس روپے۔ فی پرچہ دس آنے

پتہ:۔ ماہنامہ "شاھراہ"۔ اردو بازار دھلی

ایڈوِن میور

فطری آدمی اور سیاسی آدمی

جدید ناول کی تاریخ مذہب اور انسانیت کے تصور کردہ آدمی کے معدوم ہونے کی تاریخ ہے
اس آدمی کی جگہ فطری آدمی کی ایک ایسی نئی قسم پیدا ہو چلی ہے جو حیاتیاتی تسلسل اور سماجی نظام
سے عبارت ہے۔ یہ نیا فطری آدمی ترقی کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن مذہب کے فطری آدمی کی طرح اسے
دوسری زندگی کی ضرورت نہیں۔ وہ محض ایک انسانی نمونہ (MODEL) طبعی سطح پر لامحدود
ترقی کر سکتا ہے۔ ایسی ترقی جس کا سماجی ارتقا یا بحیثیت مجموعی خارجی اشیاء کے ارتقا پر قطعی انحصار ہے۔

گذشتہ صدی کے اواخر میں اس نئے فطری آدمی کو سوچنے والا حیوان کہنا فیشن میں داخل ہو چلا
تھا۔ اس وقت سے وہ حیوانِ منفرد کہلایا جاتا ہے۔ زندگی سے موت تک اس کی ساری نشوونما خالصتاً طبعی
ہوتی ہے۔ اور ان حدود میں یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ وہ بچپن، لڑکپن، محبت، بلوغت کے تمام مراحل فطرت کے
تقاضوں سے مطابقت رکھتے ہوئے طے کرے ورنہ بصورت دیگر وہ احساسِ محرومی کا شکار ہو جائے گا۔ یا
اس کی شخصیت مسخ ہو جائے گی۔ اس کی تربیت، ماحول اور ذہنی نشوونما میں فطرت کے تقاضوں سے
ہم آہنگ رہنے کی ہر ممکن کوشش ہونی چاہیے۔ اس کوشش کے بعد ہی اس کے مکمل یا کم از کم تسلی بخش حد
تک مکمل ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ آزادانہ فطری نشوونما کے باوجود آدمی تسلی بخش حد
تک بھی مکمل نہیں بن پاتا۔ اس کی شخصیت میں ناتمامی اور محرومی کا کچھ نہ کچھ عنصر ضرور باقی رہ جاتا ہے۔ اس
کمی کا جواز ہمارے سیاسی اور سماجی نظام کی ناتمامیوں میں تلاش کیا جاتا ہے۔ اور یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ
ایک مکمل اور بے نقص نظام آدمی کی تکمیل میں رہی سہی کمی بھی پوری کر سکتا ہے۔ فطری آدمی کے اس
تصور نے نتیجتاً سیاسی آدمی کو جنم دیا۔ یعنی ایسا آدمی جو یہ محسوس کرتا اور چاہتا ہے کہ تمام فطری آدمی
یا ان کی اکثریت اور اگر یہ بھی نہ ہو تو کم از کم فطری آدمیوں کی ایک طاقتور اقلیت اجتماعی کوششوں

ہر فطری آدمی کو زیادہ سے زیادہ فطری طور پر اپنی فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے۔ اور نشو ونما دینے کا موقعہ فراہم کرے۔

اس نئے فطری آدمی اور مذہب، انسانیت اور قدیم روایات کے فطری آدمی میں بہت معمولی فرق ہے۔ پہلے فطری آدمی کو روحانیت کے احساس یا دوسرے الفاظ میں اخلاقی وجود کے بغیر صحیح معنوں میں انسان نہیں تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس احساس یا اخلاقی وجود کے حصول کے لئے اس کو حیاتیاتی عمل کے دائرہ سے باہر سفر کرنا پڑتا تھا۔ اس سفر کے خاتمہ پر آدمی کو نئی زندگی ملتی تھی اور وہ اس طرح اپنے حقیقی وجود کی تکمیل کر کے زمان ومکاں میں اپنے منفرد مقام کی اہمیت کا شعور حاصل کرتا تھا۔ ہم اس نئے آدمی کو، فطری آدمی کا ہمزاد کہہ سکتے ہیں جو فطری آدمی کے اندر چھپا ہوا ہے۔ اور انسان بن کر نکلنے کی راہ ڈھونڈ رہا ہے۔ بہرحال چونکہ نئے آدمی کا وجود صرف پرانے آدمی کے وجود ہی میں ہو سکتا ہے۔ اس لئے دونوں، صورتوں میں یہ باہمی وجود فرد کے اندر ایک اخلاقی کشمکش پیدا کر دیتا ہے۔ یہ کشمکش فرد کی معاشرے سے ہم آہنگ ہونے یا معاشرے کو ہم آہنگ بنانے کی کشمکش کی مختلف طریقوں سے حد بندی کرتی ہے۔ یہ اخلاقی کشمکش اپنی ناگزیر نوعیت اور طلب منفعت کی تحریصات سے جدا ہونے کی بنا پر موخر الذکر کشمکش سے بہت مختلف ہے۔ کئی صدیوں تک فرد کی اس اندرونی اخلاقی کشمکش کو جو بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ انسانی سرشت کا ایک ضروری خاصہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ اپنی اس سرشت کی بنا پر اپنی ذات میں خیر وشر کی رزم گاہ بنا ہوا یہ آدمی ہم کو دانتے، شیکسپیر، بالزاک، اور ٹالسٹائی کے ہاں ملتا ہے۔ یہاں حیاتیاتی اصولوں کی دنیا سے الگ اس کی اپنی خاص مملکت ہے۔ جہاں اس کے حقوق بھی سب سے الگ ہیں اور معنویات بھی۔

لیکن کئی ایک نسلوں کے دوران میں اس مملکت کی حصاریں ٹوٹتی گئیں۔ رفتہ رفتہ نئی نوع انسان کو خود اختیارانہ زندگی کے حق سے محروم کر کے فطری بہاؤ کا محکوم بنا دیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آدمی کا قد گھٹ کر رہ گیا۔ اور آدمی بہت آسان، زیادہ سفلی، زیادہ حقیقت پسند اور اسی تناسب سے زیادہ بے معنی اور ہیچ ہو کر رہ گیا ہے۔

مسیحی دینیات اور دانتے، ملٹن، پاسکل اور سولھویں اور سترھویں صدی کے انگلستان اور فرانس کے المیہ شاعروں کے آدمی اور اس آدمی کے درمیان جس کو ایچ جی ویلز، ڈی ایچ لارنس، ہکسلے ہمینگ وے، مانترلاں اور بے شمار مقبولِ عام ناول نگاروں نے پیش کیا ہے۔ فرق کی پہچان اہم ہونے کے باوجود بہت مشکل ہے۔ ایک طرح سے اس فرق کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ جدید آدمی کے لئے زندگی

صرف ارتقا اور نشو و نما کا نام تھا تو روایاتی آدمی کے لئے فرد کی زندگی عقل اور جذبے کے درمیان ایک کشمکش تھی۔ اس کشمکش کا مختلف شکلوں میں اظہار ہوا ہے۔ لیکن اس کی زیادہ واضح شکل ہم کو ملٹن اور راسین کے ہاں ملتی ہے۔ کیونکہ یہ شکل ہمارے طریقۂ فکر سے قریب ہونے کے باعث آسان فہم ہے۔ فرد کی زندگی میں عقل اور جذبے کی کشمکش کا یہ نظریہ سترہویں صدی اور اٹھارہویں صدی کے اوائل تک بھی رہا۔ لیکن اس قدر میکانکی طور پر کہ۔ عقل اور جذبہ فرد کی زندگی کے اجزائے ترکیبی بننے کے بجائے الگ الگ خانوں میں منقسم ہو گئے تھے

رومانی تحریک نے جذبے کو بحال کرنے کے علاوہ ایک اور کام بھی کیا۔ اس نے عقل اور جذبے کی کشمکش کی جگہ دونوں کے ایک صوفیانہ امتزاج کو جگہ دی۔ فرانس اپنی عقلی نقطۂ نظر کی وجہ سے سب سے پہلے اس رجحان کے عواقب سے باخبر ہو گیا۔ مادام دی استیئل سے لے کر الفرڈ دی مسیتے تک بے شمار لکھنے والوں نے جذبے کو مقدس ٹھہرایا۔ اور اس کو عقل پر ترجیح دی۔ یہ دور جس میں بائرن اور شاتوبریاں کے گمنام نقالوں نے والہانہ محبت کی۔ ناکامیوں کے قصوں کی بھرمار کر رکھی تھی۔ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ لیکن باوجود عملی طور پر ناکام ہونے کے یہ رجحان اس مفروضہ کو جنم دے گیا کہ عقل اور جذبہ تعاون کے ...... ساتھ کام کرتے ہیں۔ یہ مفروضہ اگرچہ سچ تھا تو پھر اب فرد کے لئے سوائے نشو و نما پانے کے اور کوئی کام باقی نہ رہا۔ یہ نتیجہ رومانی تخلیقات سے صرف واضح ہو رہا تھا۔ لیکن اسے باقاعدہ نظریاتی شکل اس وقت دی گئی جب ڈارون کی تھیوری اور خصوصاً فرد کی زندگی پر "اصول ارتقا" کے اطلاق کا نظریہ سامنے آیا۔ اب فرد کی اندرونی زندگی میں قدیم کشمکش کا وجود معدوم یا روپوش ہو چلا تھا۔ ڈارون اور دیگر کئی معاشی ماہرین نے آدمی کو زندگی کے تقاضوں سے مطابقت پیدا کرنے کی ضرورت کا احساس دلایا۔ اسپنسر اور دوسرے تصور پسندوں نے آدمی کو ارتقا کے بے انتہا امکانات سے روشناس کرایا۔ زندگی سے مطابقت حال کی ضرورت بھی اور ارتقا، مستقبل پر موقوف تھا۔ لیکن یہ مطابقت بھی تغیر کا دوسرا نام تھا۔ کیونکہ آدمی کا ماحول بدلتا رہتا ہے اور بدلتے ہوئے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کا مطلب۔ ارتقا کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ اس وقت اس بات پر سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کیا گیا کہ آدمی کے ماحول کی تبدیلی بہتر کے بجائے بدتر کے لئے بھی ہو سکتی ہے۔ اور یہ ارتقا اخلاقی اقدار سے بے نیاز بھی ہو سکتا ہے۔

آدمی کے مختلف تصورات کی تبدیلی پر غور کرنا اور اس تبدیلی کا درجہ بدرجہ تعین کرنا اتنا ہی محال ہے جتنا چند معمولی سے حیوانوں سے بڑھ کر موجودہ صورت میں آئے ہوئے ان گنت انواع و اقسام کے حیوانات کے ارتقائی عمل کے متعلق سوچنا مشکل ہے۔ آدمی کے متعلق کسی بھی وقت کا مروجہ تصور یکساں نہیں رہا

قدیم تصورات برقرار تھے۔ اور نئے تصورات آزمائشی طور پر رائج ہوتے رہے۔ انسانی زندگی کو محض ارتقاء قرار دینے اور اس ارتقاء کو... مذہبی یا اخلاقی نہیں بلکہ خالص معاشرتی اور سیاسی ارتقاء کا جز سمجھنے کے نتیجہ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ارتقاء کو مشروط کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر ضروری اقتدار اور وسائل حاصل ہوں تو انسانی زندگی بڑی حد تک قابو میں آ سکتی ہے۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ نظریہ دو بڑے ملکوں میں بہت بڑے پیمانے پر (روس میں منفعت بخش طور پر اور جرمنی میں تباہ کن حد تک) روبہ عمل میں لایا جا رہا ہے۔ اس نظریہ کا یہ مطلب ہوا کہ آدمی اپنی حرص و خوف کی کمزوریوں کی بنا پر بہ آسانی اذیت دہ سزاؤں، پروپگنڈا، تشدد یا ہمت افزائی کے زیر اثر لایا جا سکتا ہے۔ چونکہ آدمی اپنے ماحول کے زیر اثر نشو و نما پاتا ہے۔ اس لئے اگر ماحول میں چند تبدیلیاں پیدا کر لی جائیں تو کافی ہیں، اگر ایک بار کوئی طاقت ور جماعت ماحول کی ان تبدیلیوں کا تعین کر لے تو آدمی کو ڈھلے ڈھلائے اصولوں کے مطابق استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اس نظریہ کی بنیاد صرف اس نئے فطری آدمی پر رکھی جا سکتی تھی۔ جو ایک مخصوص ماحول میں کسی سو فیصد اندرونی کشمکش کسی پائدار تصورِ حیات اور اس کو پلنے کی ذاتی لگن کے بغیر بنے بنائے ہوئے اصول پر نشو و نما پاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اندرونی کشمکش اور اس قسم کی دوسری چیزیں ان نظریہ سازوں کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ کیونکہ ان کے نزدیک حکومت، بم، ٹینک، اذیت دہ سزائیں، تشدد اور پھر فطری آدمی کی نفسانی خواہشات اس کا فخر و غرور، خوف، غصہ اور نفرت کے ایسے جذبات زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، جنہیں آسانی کے ساتھ مشتعل کیا جا سکتا ہے۔ اور جو معمولی سی شہ پر خوفناک صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ نتیجتاً مذہب ارتقاء نے جس چیز کو اہم ٹھہرایا وہ اشیاء کی اولیت ہے۔ اور یہ نظریہ اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے۔ جب اشیاء پر پوری طرح سے قابو پا لیا جائے۔ یعنی اشیاء کو قابو میں کر لو پھر آدمی بھی قابو میں آ جائیگا اس تصور میں آدمی کی اخلاقی کشمکش (جو کسی زمانے میں بنیادی حیثیت رکھتی تھی اور گذشتہ صدی تک بھی جس کا اثر و نفوذ برقرار تھا۔) غیر ضروری ہو کر جسم کا ایک ایسا عضوِ ناقص بن جاتی ہے۔ جو کوئی فائدہ بخش عمل انجام نہیں دیتا بلکہ الٹا بیماری اور اذیت کا باعث بنتا ہے۔

جدید سیاسیات میں آدمی کے تصور کا گھٹاؤ ہمیں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ کیونکہ ہم یہاں آدمی کو انسانی آزادی اور انسانی زندگی (جو لازم و ملزوم ہیں) کی تحقیر پر آمادہ خاک و خون میں لتھڑا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن جدید ادب میں یہ تصور مشکل سے ملے گی۔ ڈینی سارت نے اپنی کتاب اڈرنس ..... (MODRNES) میں یہ تجزیہ کیا ہے کہ فرانسیسی ادب میں سترھویں صدی کے کلاسیکی ادیبوں نے

عقل کو مایۂ امتیاز سمجھا۔ انیسویں صدی کے رومانوی ادیبوں نے جذبے کو اولیت بخشی۔ اور چند موجودہ ادیبوں نے جوش و ہیجان کو مرکزی حیثیت دے رکھی ہے۔ یہ انحطاط جدید آدمی کے زوال کا پیچیدگی سے سادگی اور تہذیب سے جہالت کی طرف رجعت اور انحطاط کا اک خاکہ پیش کرتا ہے۔

انسانی زندگی کے متعلق ہمارے نقطۂ نگاہ میں جو تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ اس کا اندازہ ڈکنس کے کسی بھی کردار سے ہیمنگ وے کے ابتدائی ناولوں کے کسی بھی کردار کا موازنہ کرنے پر ہو سکتا ہے۔ ڈکنس بہت جذباتی لکھنے والا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے فرد کی داخلی زندگی میں فکر اور جذبے کی کشمکش کا علم تھا۔ وہ مذہبی ادیب نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوصف اس کے کردار جس فضا میں سانس لیتے ہیں وہ فطری بھی ہے، اور روحانی بھی۔ اس کے برعکس ہیمنگ وے کے کردار صرف فطری سطح پر زندہ ہیں۔ ان کی کہانی "THE KILLES" کے دو بندوقچی بے حس، جذبے سے عاری، "میکانکی" قاتل ہیں۔ ان دونوں کرداروں کی تعمیر یکساں ہوئی ہے۔ ان کے متعلق اس کے علاوہ اور کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ یہ کردار ہم میں اس قسم کا رحم اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتے ہیں، جو کسی درندے کو اپنا شکار ہلاک کرتے ہوئے دیکھ کر ہمیں محسوس ہوتا ہے۔ پوری کہانی ایک نقطۂ نظر سے حیرت انگیز طور پر فطری معلوم ہوتی ہے۔ اور دوسرے نقطۂ نظر سے حیرت انگیز حد تک غیر فطری۔ کیونکہ بحر حال یہ کردار جانور نہیں ہیں۔ بلکہ سوچنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت رکھنے والے غیر معمولی طور پر مجبور انسان ہیں۔

قاتلوں کو کوئی پچھتاوا نہیں، مقتول کے پاس سوائے جانوروں کی سی بے بس خود سپردگی کے اور کوئی احساس نہیں۔ ایک طرف جان لینے کا فوری ہیجانہ جوش تو دوسری طرف موت کا بھیانک خوف۔ کہانی کے اختتام پر یہی کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ صرف ہیجان۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

اب ذرا ڈکنس کی طرف لوٹئے — CHEZZLEWIT بھی ایک قاتل ہے۔ لیکن اس کا کردار دیکھ کر ہمارے ذہن میں بندوق یا تلوار سے مسلح حیوان کی تصویر نہیں ابھرتی۔ وہ اپنے جذبات اور خیالات کے ساتھ آخر تک انسان ہی رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں یہ جذبات اور خیالات بڑے کریہہ اور بھیانک ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کا ماخذ انسانی فکر و احساس کا سرچشمہ ہے۔ ہیمنگ وے اپنے افسانے میں صرف ہیجان کے قائل ہیں۔ چونکہ وہ ایک اصول پرست ایماندار ادیب ہیں۔ اس لئے انہوں نے فکر اور جذبے سے ہر ممکن حد تک گریز کر کے اپنے آپ کو صرف اس ہیجان انگیزی تک ہی محدود رکھا۔ ہیمنگ وے کی ابتدا فطری آدمی سے ہوتی ہے جو اپنی ضروریات کی تلاش میں نکلتا ہے۔ اور مایوس ہوتا ہے تو اپنی ناکامی

اور محرومی پر ایک زخمی جانور کی طرح تلملانے اور سر ٹپکنے لگتا ہے۔ اس ابتدا کے بعد یہ ناممکن تھا کہ ہمینگ وے کی رسائی فکر اور احساس کی دنیا تک ہوتی۔ کیونکہ یہ دنیا تو روایاتی آدمی کا ورثہ ہے۔ اور اس میں داخلہ کے لئے اس بات پر یقین رکھنا ضروری ہے۔ کہ ہم انسانوں کو ان معنوں میں فطری نہیں کہہ سکتے۔ جن معنوں میں سانپ یا بندر فطری ہیں۔

ہمینگ وے نے پہلی جنگ عظیم کے سالوں میں لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ ناکامی اور مایوسی کے دن تھے۔ جنگ کے خاتمے کے ساتھ ساتھ امیدوں اور خوش فہمیوں کا بھی خاتمہ ہو رہا تھا۔ لہٰذا ہمینگ وے نے جس فطری آدمی کی عکاسی کی وہ شکست خوردہ فطری آدمی ہے۔ فطری آدمی پر اس کے مطالبات اور ضروریات کی فطری تسکین کے دروازے نہیں کھلتے۔ تو وہ اپنی شخصیت کے خول میں سکڑ کر اپنے زخموں کو چاٹنے لگ جاتا ہے۔ یا پھر شراب اور جنس میں فرار ڈھونڈتا ہے۔ فطری آدمی کی اس ہولناک اور کریہہ زندگی کی عکاسی ہمینگ وے سے بہتر کسی نے نہیں کی ہے۔ کئی سالوں تک اس شکست خوردہ فطری آدمی کی ترجمانی کرتے رہنے کے بعد جو صرف تشدد اور جنس کے پس منظر میں اجاگر ہوتا تھا۔ ہمینگ وے کو پتہ چلا کہ فقط شکست خوردہ فطری آدمی سے کام نہیں چلتا اور اب اس فطری آدمی کو آگے قدم بڑھا کر سیاسی آدمی بننا چاہیئے۔ یہ دریافت ہمینگ وے کی صرف اپنی ہی نہیں ایک پوری نسل کی دریافت تھی۔ لیکن ہمینگ وے کے ہاں یہ چیز اس لئے زیادہ دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے کہ ان کی تحریروں میں ہم اس کا تدریجی ارتقاد دیکھ سکتے ہیں۔ ہمینگ وے نے FIESTA میں ایک بے مقصد بغاوت سے ابتدا کی! اور FOR WHOM THE BELL TOLLS میں اسپین کی جمہوری جنگ کو مقدس اور عظیم بنا کر بغاوت کو منظم کیا۔ ہمینگ وے اس کتاب میں جس آدمی کا ذکر کرتے ہیں وہ بھی وہی پرانا تشدد پسند ہوسناک فطری آدمی ہے۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ اب اس کی زبان پر چند نئے الفاظ آ گئے ہیں آزادی، اخوت، اور مساوات!! اپنی جگہ پر یہ الفاظ اس آدمی کو اپنی ذات۔ اور خواہشات کے تنگ دائرے سے باہر ارفع اور اعلیٰ مقاصد بخشنے کے لئے کافی تھے۔ لیکن یہاں بھی اس کے بنیادی رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اب بھی یہی سمجھتا ہے کہ ایک ایسی دنیا جہاں اس کی فطری نشوونما میں کوئی رکاوٹ اور مزاحمت حائل نہ ہو، صرف تشدد اور خون خرابے کے ذریعہ ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ نوع انسانی کا آدرش اس کے سامنے ایک معجزے کے طور پر ابھر آیا ہے۔ اس کی زبان پر آزادی اخوت اور مساوات کا ذکر تو ہے۔ لیکن وہ خود وقتی ہیجان کے علاوہ کسی اور چیز کے ادراک سے محروم ہے۔ اس کی دنیا ان الفاظ کی دنیا سے الگ

ہے۔ اور اس دنیا میں داخلہ کے لئے اس کے رویہ میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ایک ایسے عمل کی ضرورت ہے جو فکر اور احساس کی پیداوار ہو۔ لیکن ہمینگ وے کے سیاسی آدمی کے پاس سوائے جوش و خروش کے اور کچھ نہیں۔

آزادی، اخوت اور مساوات کے لئے ایک قسم کی بھوک ہے۔ جس کے جنون میں وہ ان مقاصد کے حصول میں حائل ہونے والی ہر رکاوٹ کے پرخچے اڑا دینا چاہتا ہے۔ لیکن اسے اس بات کا علم نہیں کہ وہ ان مقاصد سے ان کے حصول کے بعد بھی فیضیاب ہونے کا اہل نہیں ہے۔

فطری آدمی اور اس کے سیاسی مقاصد کا تضاد ہمینگ وے کی بعد کی تحریروں میں ایک عجیب قسم کی جذباتیت پیدا کر گیا ہے۔ تشدد کی یہ جذباتیت ان تمام ادیبوں کی تحریرات میں نمایاں نظر آتی ہے۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ UTOPIA ایک ایسی جنت ہے جو برق و رعد کے طوفان کے ساتھ زمین پر اتر آئے گی۔ اس سے تو ہمینگ وے کے پہلے شکست خوردہ فطری آدمی کہیں زیادہ حقیقی معلوم ہوتے تھے۔

گزشتہ جنگ کے بعد بے یقینی اور ناامیدی کے دنوں میں شکست خوردہ فطری آدمی افسانوں کا مقبول اور مثالی کردار بن گیا تھا۔ اس دور میں جو ادیب اس فطری آدمی کے متعلق لکھتے رہے ان میں سے چند ایک نے آنے والے سالوں میں اس سے منہ موڑ لیا، اور آدمی کے زیادہ مکمل اور بہتر تصور کی تلاش میں آلڈس ہکسلے کی طرح دوسری طرف نکل گئے۔ جن لوگوں نے ایسا نہیں کیا ان کے لئے فطری آدمی کو سیاسی آدمی میں منقلب کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں رہا۔ جب فطری آدمی سیاسی آدمی بن جاتا ہے تو پھر اس کے لئے آگے بڑھنے کی دو ہی سمتیں رہ جاتی ہیں — کمیونزم یا پھر فاشزم — جو آدمی کسی اندرونی مدافعت یا اخلاقی کشمکش کے بغیر آگے بڑھنا چاہتا ہو، وہ ضروری سمجھیگا کہ اس کی ترقی اور نشو و نما کی شرائط اس کے سامنے واضح طور پر رکھدی جائیں۔ تاکہ اس کی جبلتوں کے اظہار و استعمال کے لئے راستہ ہموار ہو جائے۔ اور ان جبلتوں کے راستہ پہ چلتے ہوئے وہ صرف ایک مخصوص قسم کی آزادی کا تصور کر سکتا ہے۔ مستقبل میں ملنے والی موعودہ آزادی کا تصور اتنا خوش کن اور عزیز ہوتا ہے کہ آدمی اس کے لئے اپنی جان تک دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ کمیونزم اور فاشزم دونوں کا فطری آدمی پہ اعتماد ہے۔ اور یہ دونوں نظام اس کی جبلتوں کے اظہار کے ذرائع فراہم کرتے ہیں۔ ایک نظام اگر بہتر قسم کے مادی حالات کی تشکیل کرتا ہے

تو دوسرا نظام آدمی کو ایک ایسی کھائی میں پہونچا دیتا ہے جہاں وہ ایک مقدس جنون کے عالم میں فطرت کے لئے فنا ہو جاتا ہے۔

فرد میں کسی اندرونی جدوجہد کی اخلاقی معنویت کو نظر انداز کرنے کے بعد ہر چیز کا حصول ممکن ہو جاتا ہے۔ لیکن آزادی نہیں ملتی۔

کمیونزم فطری آدمی کے مفروضہ کو قبول کرتے ہوئے اُسے اس کی خواہشات اور ضروریات کے ساتھ نہ صرف بطور آلۂ کار استعمال کرتا ہے۔ بلکہ اسے اپنے طور پر بہتر بنانے کی بھی کوشش کرتا ہے کمیونسٹ لاکھ کوشش کریں۔ لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ کمیونزم میں ماورائی تصورات ضرور شامل ہیں۔ اسی لئے کمیونزم کے مقابلہ میں فاشزم میں فطری آدمی کی اصلی شکل زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ فاشزم کی ساری بنیاد فطری آدمی پر قائم ہے۔ فاشزم کیلئے فطری آدمی ہی دینی منزل ہے۔ وہ اسی فطری آدمی کو مستقبل کی امیدوں کا مرکز قرار دیتا ہے اور اس کی مزید تعمیر یا ترقی کا قائل نہیں۔

ذہن، روح اور اعلیٰ مقاصد کے لئے حواس کا استعمال یہ سب چیزیں فاشزم کے نزدیک فطری آدمی کی تکمیل میں مانع ہونے والی رکاوٹیں ہیں۔ اس اعتبار سے ڈی ایچ لارنس اور ماں تر لاں جنہوں نے جدید لکھنے والوں میں سب سے بڑھ چڑھ کر فطری آدمی کی حمایت اور ترجمانی کی ہے۔ لازمی طور پر فاشسٹ قرار پاتے ہیں۔ دونوں کا طرز فکر غیر سیاسی ہے۔ اگر لارنس کے ہاں موجودہ صنعتی تمدن کی منافقت اور کھوکھلے پن کو بڑی بے رحمی سے بے نقاب کیا گیا ہے، تو ماں تر لاں کے ہاں اس دور کی ریاکاری پر نفرت اور حقارت کا اظہار ہوا ہے۔ ماں تر لاں نے فطری آدمی کے حقوق کی زبردست حمایت کی ہے۔ ماں تر لاں اور لارنس دونوں فطری آدمی کے نقطۂ نظر سے سماج پر تنقید کرتے ہیں۔ لارنس کو صنعتی نظام پر اعتراض اس لئے ہے کہ یہ نظام انسان کی جائز اور معصوم فطری تحریکات سب سے بڑھ کر جنس جیسی بنیادی تحریک — کو بھی کچل کر رکھ دیتا ہے۔ یہ اعتراض اپنی بنیادی نوعیت کی بنا پر اہم ہے۔ لارنس موجودہ دور کی بہیمانہ اور غیر انسانی زندگی کے مقابلہ میں "خون" اور "مٹی" کی اقدار رکھتے ہیں۔ یہ اقدار اولین فطری اقدار ہیں۔ اور چونکہ فطری اقدار ہیں اس لئے لارنس کے لئے اہم اور ضروری ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان اقدار کے اظہار اور توثیق کے بعد لارنس پلٹ کر فکر و خیال کو لارنس کے اپنے الفاظ میں The white consciousness یا "The bloodless

2/

(conciousness of the spirit) کے خلاف صف آرا ہو جاتے ہیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ غیر صحت مند فکر و خیال کی مخالفت کرتے ہیں یا خود فکر و خیال کی۔

لارنس نے مہذب اور متمدن آدمی کے مقابلے میں وحشی اور غیر متمدن آدمی کو قابل ترجیح قرار دیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ موجودہ دور میں، جس سے وہ اس قدر متنفر تھے، صرف ایک وحشی ہی اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔

اپنے ہمسائے سے محبت کرنے کی عیسوی تعلیم لارنس کو برافروختہ کر دیتی تھی اور وہ چڑ کر کہتے تھے کہ محبت کی بہ نسبت نفرت زیادہ مفید اور اصلیت سے قریب چیز ہے۔ کیونکہ نفرت میں جذبہ کا بے ساختہ اظہار ہوتا ہے۔ اور ایک ایسی دنیا میں جہاں زندگی میکانکی حد تک ضابطہ ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ بے ساختگی اور اضطراری اظہار لارنس کی دانست میں آپ اپنا جواز تھا۔

فطری آدمی کی تمام تحریکات محبت، نفرت، بے رحمی، غصہ حقارت ہیں اور ان کی کارفرمائی میں لارنس نے نہ صرف ایک متصوفانہ معنویت تلاش کی بلکہ ان احساسات کی ایک ایسی دیو مالا بھی مرتب کر لی جو نازیوں کی خود تراشیدہ دیو مالا سے مختلف نہیں تھی۔ فرق تھا تو صرف حسنِ اظہار اور اسلوب بیان کا اور یہ ہونا بھی چاہیئے تھا۔ کیونکہ لارنس آخر ایک زبردست ادیب اور فنکار تھے۔

لارنس کی خواہش تھی کہ انسان از سرِ نو خیر و شر کے اور ارتقا کی منزلوں سے دوبارہ اپنا سفر شروع کرے اور کبھی اس سفر کا خاتمہ نہ ہو۔ اگر انسان ایک بار بھی ٹھیک طور سے پیدا ہو جاتا تو لارنس مطمئن ہو جاتے لیکن مشکل تو یہی ہے کہ انسان ایک بار بھی ٹھیک طور سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ لارنس کا فلسفہ ایک خواب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ لارنس کو شکایت تھی کہ ہم لوگ جس قسم کی زندگی گذار رہے ہیں اس میں قدم قدم پر ہمارے حواس اور جبلتوں کو مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے انہیں ایک ایسی دنیا کی تلاش تھی جہاں آدمی کے لئے یہ رکاوٹیں باقی نہ رہیں۔ اور لارنس کی دانست میں ایسی دنیا ہماری موجودہ دنیا سے بہتر ہوتی۔ اسی خیالی دنیا کے حصول و قیام کے لئے لارنس نے جو راستہ تجویز کیا وہ فطری انسان کے ارتقا کا راستہ تھا۔ یہاں بھی لارنس نازیوں سے پیش پیش تھے۔ لیکن خود نازیوں نے عملی طور پر بتا دیا ہے کہ یہ راستہ کس طرح تشدد، اذیت دہی، سفاکی، جنگ اور غلامی کی طرف لے جاتا ہے۔ کیونکہ فطری آدمی جھگڑالو، تشدد پسند اور حریص تو ہوتا ہی ہے۔ اور پھر کسی اندرونی مدافعت کی غیر موجودگی کی وجہ سے وہ اور بھی جلد مغلوب ہو جاتا ہے۔

مان ترلاں کے ہاں فطری آدمی کی زیادہ پر تصنع تصویر ملتی ہے۔ یہ فطری آدمی دیرا

(Rivera) کی تمام فیشن ایبل دعوتوں میں شریک رہ چکا ہے۔ اور سماجی زندگی کی ساری اونچ نیچ سے واقف ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کے پاس سماج کے لئے صرف نفرت اور حقارت ہے وہ عقیدے کے اعتبار سے سماج دشمن ہے۔ یہ آدمی لارنس کے فطری آدمی سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ کیونکہ اس نے روح اور فکر کی زندگی کو قریب سے دیکھکر تضحیک و تمسخر کے ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ وہ اپنی اس بیوقوفوں سے بھری ہوئی دنیا کو ذلت اور حقارت کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ لیکن اس دنیا کو بدلنے کی اسے کوئی خواہش نہیں ہے اس کے لئے یہی اطمینان کافی ہے کہ وہ ایک غیر معمولی طور پر چالاک ایماندار اور بے حد اہم فطری آدمی کی ممتاز اور سربلند زندگی بسر کرے۔ وہ عوام کا آدمی نہیں۔ اس کا میل جول صرف مخصوص طبقوں میں ہوتا ہے۔ اسے اپنے حقوق تسلیم کرانے پر اصرار ہے۔

مان ترلاں کے اس فطری آدمی کا ہمزاد فاشسٹ تحریک کے ان قائدین میں ملے گا جو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے عام آدمی کے عقائد کو استعمال کرتے ہیں اور اس استعمال کو اپنی خود ساختہ اساطیر کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔

لارنس اور مان ترلاں کی اہمیت اس بنا پر ہے کہ انہوں نے فطری آدمی پر اعتقاد کے نتائج کی غیر معمولی طور پر ایماندارانہ عکاسی کی ہے۔ یہ نتائج فطری آدمی کے اولین مبلغین کی توقعات سے بہت مختلف نکلے۔ ارتقا پر ایمان رکھنے والوں کا خیال تھا کہ فطری آدمی اپنے اندر لامحدود ترقی کے امکانات رکھتا ہے۔ یہ خیال اس متصوفانہ نظریہ پر قائم تھا کہ اشیاء میں نشو و نما پانے اور مسلسل آگے بڑھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہ نظریہ مادہ کی اولیت کا اعتراف تھا۔ اور اس کی رو سے آدمی کا کام صرف آگے بڑھنا اور اپنی تکمیل کرنا تھا۔ اور خارجی ماحول کی ترقی اور ارتقاء کو یقینی طور پر آدمی کی ترقی اور ارتقاء کا ضامن اور معاون سمجھا گیا۔ لیکن جب بعد میں پتہ چلا کہ اس آگے بڑھنے والے فطری آدمی کی ایک ہی قسم سے کام نہیں چل سکتا تو پھر فیصلہ کیا گیا کہ چند لوگ ایسے بھی ہونے چاہئیں جو آدمی کے نشو و نما پانے اور ترقی کے اصول و شرائط وضع کر سکیں۔ اور جن پر باقیماندہ لوگ عمل پیرا ہو سکیں اول الذکر طبقے کے لئے انسانی عمل کو متعین کرنے کا حق مخصوص ہو گیا۔ اور دوسری اکثریت کے لئے ایسی اساطیر تراشی گئیں جو انہیں اطاعت اور جاں نثاری پر راغب اور آمادہ کر سکیں۔ اس طرح انسانی زندگی مکمل طور پر محکوم اور مطیع بنا دی گئی۔ فرد کی زندگی سے ارادہ و اختیار کی قوت اور آزادی کی خواہش تک سلب ہو گئی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بڑے سے بڑے فنکار کے تخیل کی زرخیزی اس کردار کو وسیع بنا کر نہیں پیش کر سکی۔ اگر انسانی زندگی کو خود رو تسلیم کر لیا جائے تو ظاہر ہے پھر یہ نشو و نما اور ارتقا

سادہ اور ناگزیر ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر فرد کی زندگی کو ایک کشمکش اور جد و جہد سے عبارت تسلیم کیا جائے تو لازماً اس کشمکش میں فرد کو نزکتا انتخاب کا حق حاصل رہے گا۔ اس طرح زندگی میں پیچیدگی رنگارنگی اور تنوع پیدا ہو جاتا ہے جسے کسی فارمولے یا بندھے ٹکے اصولوں کے دائرے میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ بدقسمتی سے فطری ارتقا اور خود رو نشو و نما کے غلط تصورات کے زیر اثر ادب میں زندگی کو ایک خط مستقیم کے طور پر پیش کر دیا گیا۔ انسانی زندگی کے متعلق گو یہ نظریہ ادب کی پیداوار نہیں لیکن ادب نے اسکے اثرات قبول ضرور کئے۔ بہت کم لکھنے والے ایسے تھے جنھیں اپنی روایات کا گہرا احساس اور وقت کا شعور حاصل رہا۔ اور جو ان رجحانات کے سامنے سپر انداز نہیں ہوئے۔ اس قسم کے لوگوں میں، ناول نگاروں میں پرسٹ جیمس جوائس اور ورجینا وولف کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ شاعروں میں بھی ایسے دو چار نام آسانی سے مل جائیں گے۔ ان لوگوں کے ہاں روایات پر غیر معمولی اصرار در اصل اس موجودہ انسانی بحران کا رد عمل ہے۔ لیکن لارنس، مان نزلاں اور ہیمنگوے مکمل طور پر جدید دور کے آدمی ہیں۔ تاریخ نے جو نیا ورق الٹا ہے جس پر موجودہ جنگ لکھی جا رہی اس ورق کو یہ لوگ نہ صرف قبول کر چکے ہیں بلکہ خود اس پر لکھ رہے ہیں۔ لیکن انہیں شاید اس بات کی خبر نہیں کہ تاریخ کے ہر باب میں لکھے جانیوالے ابتدائی الفاظ خواہ وہ کتنے ہی بڑے ادیب یا فنکار کے نہ ہوں، کبھی نئے نہیں ہوتے۔ یہ الفاظ انہیں الفاظ کا اعادہ ہوتے ہیں جو ہر دور میں تاریخ کے ہر نئے ورق پر لکھے جا چکے ہیں۔ تمدن کے آغاز سے قبل سے اب تک ان الفاظ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ گو تمدن کے ارتقا نے زندگی کے مادی ڈھانچے میں کچھ موہوم تبدیلیاں ضرور پیدا کر دیں۔

(ترجمہ: محمود سعید)

★

میر ضیاء اللہ

فراق ایک مطالعہ

فراق کی شاعری پر قلم کرنے سے پہلے اگر ہم فراق کی زندگی کے حالات پر ایک سرسری نظر ڈال لیں تو ہمیں فراق کی شاعری کا جائزہ لینے میں بہت مدد ملے گی۔ اردو ادیبوں کی شخصیات اپنے اچھے اور بُرے پہلوؤں کے ساتھ بہت کم ہماری نظروں کے سامنے آئی ہیں۔ ہمارے اکثر سوانح نگار شخصیات کے کمزور پہلوؤں کے اظہار سے ہچکچاتے رہے ہیں۔ خود نوشت سوانح تو ہمارے ہاں شاذ ہی پائی جاتی ہیں۔ فراق کی زندگی کے حالات اگر کوئی سوانح نگار لکھتا تو شاید فراق کو دیوتا بنا دیتا لیکن خوش قسمتی سے خود فراق نے اپنے متعدد خطوط میں اپنی زندگی کے حالات بڑی بے باکی سے بیان کر دیے ہیں، یہ خطوط رسالہ "نقوش" میں شائع ہو چکے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ فراق نے اپنی شخصیت کی حد تک ہمیں سوانح نگار کی روایتی شرافت سے بچا لیا اور بڑی دلیری سے اپنی تمام انسانی کمزوریوں کا اعتراف کیا ہے۔

اب تک اردو ادب میں جتنی بھی سوانح لکھی گئی ہیں، ان میں شخصیات کے صرف اچھے پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے اور غفلتاً یا اختراعاً بُرے اور کمزور پہلوؤں کی پردہ پوشی کی گئی ہے۔ کسی کی سوانح پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی فرشتے کی سرگزشت پڑھ رہے ہیں، ہماری مشرقیت ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر چکی ہے کہ انسان کی انتہا فرشتہ بن جانا ہے۔ ہم نے کبھی غور نہیں کیا کہ فرشتے کی انتہا کیا ہے (بقول سجاد انصاری فرشتے کی انتہا یہ ہے کہ شیطان ہو جائے۔)

ہمارے ادب میں جان نثر بہت ہیں مگر باسول کوئی نہیں۔ ہم انسانی کمزوریوں اور برائیوں کو اخلاق کے خلاف سمجھتے ہیں۔ مشرق کے تمام مذاہب نے اخلاقیات کی بنیاد پر مشرقی تہذیب کو استوار کیا ہے، اس کے باوجود ہم میں اخلاقی کمزوریاں پائی جاتی ہیں، اور اس پر مستزاد یہ کہ ہم اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر پردہ ڈالتے رہتے ہیں تاکہ ہماری مشرقی تہذیب رسوا و ذلیل نہ ہو جائے۔ انسان سے تو روزِ ازل ہی سے لغزشیں ہوتی آئی ہیں، آدم کی ایک لغزش کی بدولت "سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو" کا یہ جہانِ رنگ و بو آباد ہوا۔ عالمی ادب کی تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کوئی فنکار لغزش میں آیا ہے تو اس نے ادب کی کئی نئی دنیائیں آباد کر دی ہیں۔ ردمو آندری ژید اور فرینک ہیرس نے اپنی خود نوشت سوانح میں اپنے عنفوانِ شباب کی تمام لغزشوں کا بالتفصیل ذکر کیا ہے، اپنی کمزوریوں کا اعتراف خود آپ کرنا

بڑی اخلاقی جرأت ہے۔ فنکاروں کی شخصیت تو ہمارے سامنے ہوتی ہی ہے لیکن جب ہم ان کی کوتاہیوں سے واقف ہو جاتے ہیں تو ان کی عظمت ہماری نظروں میں اور بڑھ جاتی ہے۔ اس طرح ان لوگوں کی شخصیات اپنے اصلی روپ میں ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ اور ہم آسانی کے ساتھ ان کی تحریروں کے پس منظر سے بھی واقف ہو جاتے ہیں۔

فراق نے بھی اپنے خطوط میں اپنی زندگی کے روشن اور تاریک دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، مگر فراق کی یا اردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ یہ خطوط اپنی اصلی شکل میں منظر عام پر نہ آسکے۔ ایڈیٹر کے بے رحم قلم نے ان خطوط سے فراق کی شخصیت کے ان مظاہر کو کاٹ ڈالا ہے جو "اخلاق" کے زد میں آئے تھے۔ مغربی ادب اور خصوصاً فرانسیسی ادب کی جسارت ہمارے ادب میں ابھی تک پیدا نہیں ہو سکی شاید اس کے لئے وقت اور ماحول سازگار نہیں، مگر اس ادبی جسارت کی مہورت فراق گورکھپوری کے ہاتھوں ادا ہو چکی ہے

فراق کا جنم ۲۸ اگست ۱۸۹۶ء کو بمقام گورکھپور ہوا۔ ان کے والد منشی گورکھ پرشاد عبرت شہر کے مشہور وکیل تھے اور شاعر بھی، فراق نے ایک ایسے گھر میں جنم لیا، جہاں کا ماحول سراسر ادبی تھا۔ ماحول کا اثر فراق پر ہونا لازمی تھا، فطرت نے طبیعت میں اعلیٰ ذہانت اور حسن پرستی ودیعت کر رکھی تھی، ماحول نے اسے اور اجاگر کر دیا، وہ بچپن ہی سے حسن پرست واقع ہوئے تھے اور ہر حسین شے پر جان چھڑکتے تھے۔ انہیں بدصورتی سے انتہائی نفرت تھی۔ ان کی والدہ کا کہنا ہے کہ وہ دو تین برس کی عمر ہی میں کسی بدصورت مرد یا عورت کی گود میں جانے سے انکار کر دیا کرتے تھے۔ بچپن ہی سے خوبصورت چیزوں سے انہیں انس تھا، شعر تو بچپن یا کم عمری میں انھوں نے نہیں کہا، مگر اکثر اوقات وہ ایسا محسوس کرتے کہ ان کے ذہن کے اندر کوئی چیز نشو و نما پا رہی ہے، جو ظہور پذیر ہونے کو بے تاب ہے، شاعری کے لئے ایک ضرب کی ضرورت تھی، سو تقدیر نے لگا دی، یہ ایک ایسی ضرب تھی کہ جس کے لگتے ہی فراق کے ذہن نے اپنے واردات قلبی کو شاعری کے روپ میں ڈھالنا شروع کر دیا، ہوا یہ کہ سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں فراق کی شادی کر دی گئی، یہ شادی ان کے والدین کو دھوکہ میں رکھ کر کی گئی، ایک فطری جمال پرست کے حصہ میں ایک بدصورت رفیقۂ حیات آئی، وہ فراق جو بچپن میں بدصورت انسان کی گود میں جانے سے انکار کر رہا تھا، سماج کے بندھنوں کے ذریعہ مجبور کر دیا گیا کہ ایک بدصورت جیون ساتھی کی آغوش میں زندگی کاٹے۔ مزید برآں ایک طرف فراق کا اعلیٰ ادبی ذوق اور دوسری طرف بیوی معمولی لکھنے پڑھنے سے بھی ناواقف، یہ صدمہ فراق کے لئے یقیناً جانکاہ تھا، مگر فراق کی سخت جانی اسے سہہ گئی۔ اس صدمہ نے ان کے ذہن کو ایسا دھکہ دیا کہ وہ مسلسل سال بھر تک نیند نہ کر سکے، جس کی وجہ ان کی جسمانی صحت مستقل طور پر خراب ہو گئی۔ تقدیر نے انہیں سماج کے بندھنوں میں جکڑ دیا تھا۔ وہ چاہتے تو ان بندھنوں کو توڑ سکتے تھے مگر ان کے ضمیر نے اس بات کو

گوارا نہیں کیا۔ ان کی شرافت نفس ضبط و تحمل کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار نہیں کر سکتی تھی ؎

کہاں ہر ایک سے انسانیت کا بار اٹھا — کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی

ان کی روح کی بے چینی بڑھتی ہی گئی۔ شادی سے خانہ آبادی تو نہ ہو سکی، البتہ ادب آباد ہو گیا۔ فراق کی زندگی کا یہ بلیدان اردو ادب کے حق میں بہت مفید ثابت ہو گیا، کچھ عرصہ تک ان کا دماغی توازن بگڑا رہا۔ مگر بہت جلد انھوں نے سنبھالا لیا۔ فطرت نے علم دوستی کا جوہر عطا کیا تھا، فراق نے اپنی خانگی زندگی سے راہ فرار اختیار کرنی چاہی تو اس علم دوستی نے انہیں پناہ دی۔ ایک محاذ پر انھوں نے شکست تسلیم کر لی اور دوسرے محاذ پر اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ انھوں نے اپنی ساری انرجی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں صرف کر دی۔ یونیورسٹی کی تعلیم ابھی ادھوری ہی تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور کنبہ کی ساری ذمہ داریاں ان کے سر آن پڑیں۔ فراق نے انتہائی جرأت کا ثبوت دیا۔ انھوں نے زندگی کے بوجھ کو تن تنہا اٹھا لیا، ایسے تکلیف دہ اور کرب آگیں حالات میں فراق نے شاعری شروع کی۔ یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انہیں آئی سی ایس اور پی سی ایس ہونے کا موقع بھی ملا۔ مگر انھوں نے ایک ادبی منزل کا تعین کر لیا تھا، ان دنوں ہندوستان کی آزادی کی تحریک زوروں پر تھی، وہ اس تحریک میں شامل ہو گئے اور جیل بھی گئے۔ خانگی زندگی کی ناکامیوں نے ان پر جو ضرب لگائی تھی اس کا زخم بہت گہرا تھا، اس کو مرہم کی ضرورت تھی، ازدواجی زندگی کی تلخی کو شیرینی میں بدلنے کے لئے انھوں نے ادب کا سہارا لیا۔ اپنی ازدواجی زندگی کے مسلسل عذاب بن جانے کے بعد انہوں نے عشق کی کئی زندگیاں بسائیں۔ انہوں نے کئی عشق کئے، یہ عشق کبھی کامیاب رہے اور کبھی ناکامیاب لیکن اس عشقیہ زندگی کے خوشگوار اور ناخوشگوار حالات و تجربات نے ان کی شاعری کو زندگی بخشی۔

فراق نے ایک مکتوب میں اپنی عشقیہ زندگی کا اجمالی خاکہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ——

"پہلا عشق ۱۲ دسمبر ۱۹۱۴ء میں ہوا، جو چند ہفتوں کی خوشگواریوں کے بعد ناقابل برداشت ناکامی میں تبدیل ہو گیا۔ اور یہ پہلا عشق دس بارہ برس تک مسلط رہا۔"

"دوسرا زبردست عشق ڈیڑھ برس تک رہا، پھر کسی ان بن یا ناخوشگواری کے بغیر ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا ہو جانا پڑا۔ تیسرا عشق کئی برس بعد ہوا (تقریباً ۱۹۲۹ء میں) جو اندازاً سال بھر اس طرح چلتا رہا کہ کبھی انتہائی خوشی اور کبھی انتہائی ناکامی"

اس کے تین برس بعد ایک زبردست عشق ہوا جس میں اندازاً سال بھر خوش رہ کر بعد کو آٹھ آٹھ آنسو رونے کی نوبت آئی۔ پھر سات برس کے وقفے کے بعد ایک بہت زبردست عشق ہوا جو پانچ یا چھ ماہ تک خوشگوار رہ کر ایک مستقل عذاب میں بدل گیا، شام عیادت اسی عشق کی دین ہے۔ اس کے بعد میرا موجودہ رومان ۱۹۵۰ء میں شروع ہوا

اور یہ رومان شدید ہونے کے بجائے گہرا اور خاموش ہے اور جذبۂ محبت بہت منتقل اور متوازن ہے۔

ہوتا یہ رہا کہ جب کسی معشوق سے تعلقات ٹوٹنے لگے یا ٹوٹ گئے ہیں تو ایک لمبے وقفے کے لئے کسی اور سے محبت کرنا ناممکن ہوجاتا تھا۔ بچھڑے ہوئے معشوق کو بھولنے یا بھلانے میں برسوں لگ جاتے تھے۔ اپنی بدنصیبی کے باوجود میں بے وفا نہیں رہا ہوں، البتہ کسی بچھڑے ہوئے معشوق کو بھلائے بغیر بھی جھک مار کر یا آزمائشاً کچھ لوگوں سے میں نے محبت کی ہے، لیکن یہ تجربے قبل از وقت ثابت ہوتے تھے":

اگر ہم فراق کی عشقیہ شاعری کو ان کی عشقیہ زندگی کے پس منظر میں جانچنے لگیں تو وہ تمام زیر و بم ہماری سمجھ میں آسانی سے آسکتے ہیں جو ان کی شاعری میں پائے جاتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ فراق کی ذہنی اور علمی زندگی کی تربیت بہت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی ہے۔ انہوں نے علم کی پیاس بجھانے کی خاطر اعلےٰ تعلیم حاصل کی اور خصوصاً انگریزی ادب ان کا خاص سبجکٹ رہا، ورثہ میں انہوں نے سنسکرت کلچر پایا۔ ماحول نے انہیں گنگا جمنی ہندوستانی کلچر سے آگاہی بخشی جس پر انہیں ناز ہے، وہ ایک ایسے سنگم پر کھڑے ہیں جہاں ایک طرف سے مغربی ادب کا دریا آتا ہے تو دوسری طرف سے سنسکرت ادب کا اور تیسری طرف سے اس عظیم الشان مشترکہ ہندو مسلم کلچر کے پروردہ اردو ادب کا دریا رواں دواں ہے، انسانی تہذیب کے ان تینوں دریاؤں کے ملاپ سے جو سمندر بنا ہے۔ اسی سے فراق سیراب و فیض یاب ہوتے ہے، اگر ہم فراق کی شاعری کا غور سے مطالعہ کریں تو ہمیں ان تینوں تہذیبوں کے بلند اقدار کا ایک حسین و جمیل اشتراک نظر آئیگا، جو بلاشبہ اردو ادب کا مایۂ ناز سرمایہ ہے۔

فراق نے جب شاعری کی دنیا میں قدم رکھا تو اس وقت اردو ادب میں امیر اور داغ کے طرز کا بول بالا تھا۔ فراق نے مبتدی کی حیثیت سے امیر کے رنگ میں کہنا شروع کیا، مگر یہ رنگ صرف چند دنوں تک باقی رکھا وہ دہلی اسکول کے دلدادہ تھے اور ابھی ان کی فطرت کو کسی اور چیز کی تلاش تھی کہ ان کے پہلے عشق نے ان کو ایک نئی منزل کی جانب موڑ دیا۔ یہ عشق ان پر دس بارہ برس تک مسلط رہا اور اس دوران میں ان کا فن تجرباتی دور سے گذرتا رہا۔ آہستہ آہستہ ان کا لب و لہجہ بدلتا گیا۔ اور ان کے کلام میں انفرادیت آتی گئی۔ اس دور کے تجربے گویا ان کے فن کو نکھار دیا۔ اور انہیں اس قابل بنا دیا کہ آئندہ چلکر وہ ایک خاص طرز کے موجد بن سکیں۔ اس دور کی شاعری میں زندگی کا المیہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، وہ فانی کی طرح قنوطی نہیں ہیں۔ فانی کے یہاں تو صرف زندگی کا نوحہ ہے، ایک قسم کی آہ و بکا ہے۔ کرب و بلا کی کیفیت ہے مگر فراق کا المیہ ایسا نہیں، اُن کا غم اپنے اندر بڑی گمبھیرتا لئے ہوئے ہے۔ اگر ہم اسکو کلاسکی کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اس دور میں فراق نے ایسے شعر بھی کہے ہیں۔

دل دکھے روئے ہیں شاید اس جگہ اے کوئے یار　　خاک کا اتنا چمک جانا ذرا دشوار تھا

سوغات

غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست — وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

ہمیں ہیں گل ہمیں بلبل ہمیں ہوائے چمن — فراقؔ! خواب یہ دیکھا ہے قید خانے میں

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں — خیر تم نے تو بے وفائی کی

کچھ آدمی کو بھی مجبوریاں ہیں دنیا میں — ارے وہ دردِ محبت سہی تو کیا مر جائیں

پہلے محبوب کو اگر چھوڑ دیں گو ہم فراقؔ کی شاعری کا عبوری دور کہیں تو ٹھیک ہوگا۔ اس دور میں ان کی آواز اپنے آپ کو سمیٹ رہی تھی۔ ان کا پہلا عشق تجربات اور آزمائشوں کا عشق تھا۔ اس پہلے محبوب کی بدولت ان کے کلام میں ایک خاص قسم کا انوکھا بانکپن آ گیا جس کا اظہار دوسرے عشق کے بعد سے ہوا۔ اس کے بعد فراقؔ کی شاعری کا رنگ نکھرتا گیا، محبوب بھی بدلتے رہے، "شام عیادت" کے محبوب تک تین عشق ہوئے۔ اس دوران میں تقریباً ۱۹۳۶ء میں فراقؔ نے مارکسی فلسفہ کا مطالعہ کیا اور اس کو قبول کر لیا۔ انھوں نے جابجا اپنی غزلوں اور نظموں میں مارکسی عقیدے کو سمونے کی کوشش کی، مگر ہر جگہ عشق ہی غالب رہا۔ انہوں نے مارکسی عقیدہ اختیار تو کر لیا مگر اس عقیدے کو شاعری میں کامیاب طریقے سے نباہ نہ سکے۔ اس دور میں جو نمایاں تبدیلی ان کے کلام میں پیدا ہوئی وہ لہجے کی نرمی ہے۔ دوسرے شاعروں کی طرح فراقؔ بھی ایک عاشق ہے، وہ ہجر و وصال، تنہائی و جدائی، بیم و رجا، وصل و فراق، وفا و جفا کا ذکر کرتا ہے۔ مگر اس کا لہجہ دوسرے شاعروں سے بالکل جدا ہے۔ ہر شاعر کا عشق جدا جدا خوبیاں لئے ہوئے ہے۔ میرؔ کے عشق میں سادگی پائی جاتی ہے۔ غالبؔ کے عشق میں سرحدِ ادراک سے پرے والی کیفیت ہے۔ اقبالؔ کے یہاں عشق ایک فلسفہ بن گیا ہے۔ لیکن فراقؔ کے ہاں عشق خالص ہندوستانی طرز کا عشق ہے۔ ہندی شاعری میں عشق کا اظہار عورت کی جانب سے ہوتا ہے، اس لئے اس قسم کے عشق اور اس کے اظہار میں نرمی پائی جاتی ہے۔ غالباً اس قسم کے عشق کی ابتدا کرشن جی کے زمانہ سے ہوئی۔ کرشن جی کسی کے عاشق نہیں تھے۔ وہ گوپیوں کے معشوق تھے، گوپیاں ان کے عشق میں جلا کرتی تھیں اور برہا کے گیت گایا کرتی تھیں۔ یہی روایات ہندی شاعری میں چلی آئیں۔ عشقیہ چیزیں عورت کی جانب سے لکھی جانے لگیں۔ حالانکہ اس کے مصنف مرد ہوا کرتے تھے، عورت کے عشق میں اور اس کے اظہار میں لہجے کی نرمی کا پیدا ہونا فطری ہے۔ وقت کے ساتھ نئی نئی تہذیبوں کے میل ملاپ نے فکر و ذکر کے نئے نئے طریقے پیدا کئے۔ فارسی شاعری میں عشق کا اظہار مرد کی جانب سے ہوا، اور یہ چیز اردو ادب میں آ گئی۔ فراقؔ کو بھی یہ طرز اختیار کرنا پڑا۔ مگر فراقؔ نے گوپیوں کے اسلوبِ اظہار اور لہجہ کی نرمی کو بہت سلیقہ اور فنکارانہ انداز میں اپنی شاعری کا جزو ۔۔۔۔ بنا لیا۔

فراقؔ کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جذبات سے مغلوب نہیں ہیں۔ ان کی شاعری

میں حزن وملال پایا جاتا ہے۔ مگر ہم اس کو قنوطیت نہیں کہہ سکتے۔ اُن کے ہاں جذبات کے ساتھ ارادے کی قوت بھی
کارفرما ہے۔ انہیں ہجر و وصال دونوں کے تجربے حاصل ہیں۔ ان کی شاعری میں جو وصالِ محبوب کے تذکرے
ملتے ہیں وہ محض خیال آرائی یا خوش فہمی نہیں ہے بلکہ حقیقی تجربات ہیں۔ ان کے غم میں ایک ایسی میٹھی کسک پائی جاتی
جو ہجر و فراق کے بعد نصیب ہے۔ فراق کے غم کھانے کا انداز دوسروں سے بالکل جدا ہے۔ ہماری شاعری کا
بیشتر المیہ حصہ ہمیں رنجیدہ بنا دیتا ہے اور ہمیں زندگی سے بیزارگی پیدا کر دیتا ہے مگر ہم فراق کے المیہ کا مطالعہ کرتے
ہیں تو نہ مایوس ہوتے ہیں نہ زندگی سے بیزار، ان کے المیہ میں زندگی دوڑتی پھرتی نظر آتی ہے۔ جو کرب و الم کے
عالم میں بھی جینے کے لئے کوشاں ہے۔ فراق کے غم میں غمِ عشق سے زیادہ فراق کی شخصیت ابھرتی ہوئی نظر آتی
ہے، یہی نہیں بلکہ ان کے معشوق کی شخصیت بھی بہت نازک انداز میں جھلکنے لگتی ہے، وہ انتہائی جذباتی ہونے
کے باوجود جذبات کے رو میں نہیں بہہ جاتے۔ ان کے دماغ کی رگیں ان کے دل کی رگوں کی طرح حساس اور بیدار ہیں۔
وہ اپنے واردات قلبی کی ترجمانی کرتے ہیں تو پہلے ان کا دماغ ان واردات کو پرکھتا ہے۔ فراق کے معاشقوں میں
جدائی اور ہجر کے واقعات بھی ہیں۔ ان کی عشقیہ زندگی کرب و بلا کی منزلوں سے بھی گذر چکی ہے، ان کی محبت محبوب
کے بے رحم ہاتھوں سے شہید بھی ہوئی ہے۔ مگر فراق کے اندر فطرت کا عطا کردہ جوہر ان کو سنبھالتا رہا۔ وہ بڑی
جرأت کے ساتھ غمِ عشق اور غمِ زندگی کو سہتے اور شاعری کے سانچے میں ڈھالتے رہے مگر ہمیشہ اپنے جذبات
پر ان کے دماغ کی کڑی نگرانی رہی، یہی وجہ ہے کہ ان کی المیہ شاعری پڑھنے والوں کو قنوطی نہیں بناتی۔ حسن و عشق
کے غم انگیز اور مہلک تجربات بھی فراق کی شاعری کو محض دردناک چیز نہ بنا سکے۔ انہوں نے اپنی ذاتی ناکامی
کو کبھی بھی صرف فلسفۂ حسن و عشق مرتب کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا، زندگی کی بنیادی اقدار اور فکر کی آفاقیت ہمیشہ ان
کے پیشِ نظر رہی، ورنہ آج فراق کا غم فانی کے غم کی طرح صرف ان کا اپنا غم بن کر رہ جاتا، انہوں نے غمِ عشق
کو آفاقی رنگ دے دیا ہے جس طرح انہوں نے جمالِ انسانی کے نشاطیہ پہلو کو اپنی شاعری میں اجاگر کیا ہے
اسی طرح انہوں نے غمِ عشق کو بھی نشاط آور بنا دیا ہے۔ ان کا غم نشاط کی سرحدوں کو چھو لیتا ہے اسی لئے
انہیں زندگی کی لہریں دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ان کی شاعری میں ہمیں ایک ایسی عظمت نظر آتی ہے جو حسنِ انسانی
کے نازک تصورات سے معمور اور عشق کے ایک نئے کلچر سے مملو ہے۔ ان کے تفکر میں سنجیدگی ہے، خلوص ہے
شرافت ہے، بحیثیت انسانیت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ روحانیت کا ایک ایسا حسین امتزاج ہے
جو کائنات کو وجد میں لا دینے والی چیز ہے۔ خصوصاً ان کے لہجے کی نرمی میں ایک ایسا آفاقی ترنم ہے جو اردو
شاعری میں ایک نیا اضافہ ہے، کئی نقادوں نے فراق کی فنی اور لسانی لغزشوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مگر بقول نیاز فتحپوری "فراق نے کلاسیکل غزل گوئی کو اس زمانے میں بہت کچھ دیا ہے، ان کی شاعری ماضی کی شاندار روایات، حال کے میلانات و رجحانات اور مستقبل کی تمناؤں کا بڑا دلکش امتزاج ہے اور ہم اس کے پرخلوص لب و لہجہ سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ اس کی فنی اور لسانی لغزشوں کی طرف سے بھی تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

فراق کے پہلے عشق سے لے کر "شامِ عبادت" کے محبوب کے عشق تک اس کا رنگ اس نہج پر آچکا تھا۔

نیرنگِ حسنِ یار ترے بس میں کیا نہیں   لطف و کرم تو مانعِ جور و جفا نہیں

جن کی صدائے درد سے سینے ہیں چاک بھی   نالے اب ان کے بند ہیں تونے سنا نہیں

تجھ سے حجاب کیا مگر اے ہمنشیں نہ پوچھ   اس دردِ ہجر کو جو شبِ غم اٹھا نہیں

وہ محروم عاشق نہیں ہے اس کو وصال بھی حاصل ہوا ہے۔ وصال کے تجربات کا تجزیہ کرتے ہوئے فراق نے بڑی نفسیاتی باریکیاں بیان کی ہیں۔

کچھ گراں ہو چلا ہے بارِ نشاط   آج دکھتے ہیں حسن کے شانے

آج آغوش میں تھا اور کوئی   ہم تجھے دیر تک بھلا نہ سکے

محبوب کے جمال کا مشاہدہ فراق نے بالکل نئے انداز سے کیا ہے،

تنا ہوا سا گداز سینہ کچھ اس طرح سے جھلک رہا ہے   کہ جیسے پرچھائیاں سی اس پر کہیں سے رہ رہ کے پڑ رہی ہیں

حسن پر پڑتا ہے اس انداز سے کچھ عکسِ حسن   دیکھ لیتا ہوں بدن پر چلتی پھرتی چھاؤں سی

ترا جمال ہے یا نغمۂ بہشت کی لے   کہ آج تک تو نہ دیکھا تھا یہ بدن کا رچاؤ

محبوب کو یاد کرنے کے کیا نرالے ڈھنگ نکالے ہیں

ترے خیال میں تیری جفا شریک نہیں   بہت بھلا کے تجھے یاد کرسکوں ہوں میں

تو یاد آئے ترے جور و ستم لیکن نہ یاد آئیں   تصور میں یہ معصومی بڑی مشکل سے آتی ہے

فراق کا عشق agressive نہیں ہے اس میں دل موہ لینی والی انکساری ہے، وہ فریاد بھی کرتا ہے تو اس انداز سے کہ محبوب کو... اس کا سا گمان بھی نہ ہو اور اس کے ابرو پر بل نہ آئے۔

شادی و غم سے بہت دور ہے اب منزلِ عشق   آج بھی پہونچی ہے تری رنجشِ بیجا بھی کہاں

لرزشِ صد لطف و کرم ہے یہ ترا رنگِ ستم   کچھ ہمیں جان سکے تیرا پشیمان ہونا

عشق نہ کل پھر روٹھ سکے گا   آج منا لے، آج منا لے

تعجب کیا ترے آگے جو ہم کچھ چپ سے بیٹھے ہیں
ہمارے درمیاں اے دوست لاکھوں خواب حائل ہیں

آج تو درد ہجر بھی کم ہے
آج تو کوئی آیا ہوتا

سمجھ لے راز جس دم عشق کے تنہا سحر ہیں
کہ رونے کے لئے یہ دکھ بھری راتیں نہیں ہوتیں

تھی یوں تو شام ہجر مگر پچھلی رات کو
وہ درد اٹھا فراق کہ میں مسکرا دیا

پھر آج اشک سے آنکھوں میں کیوں ہیں آئے ہوئے
گذر گیا ہے زمانہ تجھے بھلائے ہوئے

جیسے جیسے فراق کے معاشقے ہوتے رہے اور محبوب بدلتے رہے ویسے ویسے فراق کے عشق کے ساتھ ان کی شاعری میں بھی پختہ خیالی اور پختہ کاری بڑھتی گئی۔ اس دوران میں فراق کو ایک ایسے معشوق سے بھی سابقہ پڑا تھا جو یوں ہی سا تھا۔ مگر "شام عیادت" کے محبوب کی صورت اور سیرت دونوں غضب کی تھیں۔ یہ فراق کا شاید سب سے بڑا اور شدید عشق ہے۔ اس عشق کی بدولت بڑی معرکہ آرا غزلیں اور دھواں دھار رباعیاں تخلیق پائیں۔ اس دور کے محبوب کی دین ہمارے ادب کا ایک انمول اور گراں بہا سرمایہ بن چکی ہے۔ معشوق کے حسن کی جلوہ باریوں سے متعلق ہمارے ادب میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس سلسلہ میں فراق نے ایک انوکھے زاویہ سے جمال محبوب کا نظارہ کیا ہے۔ اس دور کی شاعری میں رنگ و نور کی بارش نظر آتی ہے۔ ہندو تہذیب کی لطافتوں، ایلورا، اجنتا کی فن کاریوں کا ایک حسین و جمیل امتزاج اس دور کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ "شام عیادت" کے محبوب کا سراپا ملاحظہ ہو ؎

یہ روپ سر سے قدم تک حسین جیسے گناہ
یہ عارضوں کی دمک یہ فسون چشم سیاہ

یہ سینہ پڑ ہی گئی دیولوک کی بھی نگاہ
یہ دھج نہ دے جو اجنتا کی صنعتوں کو پناہ

سبھل بدن کی بیاں کس طرح ہو کیفیت
سرسوتی کے بجاتے ہوئے ستار کی گت

وہ چال جس سے لبالب گلابیاں چھلکیں
نگاہ ناز میں ہمین کی بجلیاں جھلکیں

یہ آنکھ جس میں کئی آسماں دکھائی پڑیں
اڑا دیں ہوش وہ کانوں کی سادہ سادہ لویں

یہ کیف رنگ نظارہ یہ بجلیوں کی لپک
بس اک ستارۂ شنگرف کی جبیں پہ چمک

کہ جیسے کرشن سے رادھا کی آنکھ اشارہ کرے
وہ شوخ اشارے کہ ربانیت بھی جائے جھپک

جمال سر سے قدم تک تمام شعلہ ہے
سکون و جنبش و رم تک تمام شعلہ ہے

اس زہرہ جبیں کے جمال کا مشاہدہ کس طرح کرنا چاہیے، وہ بھی فراق کی زبانی ملاحظہ کیجیے ؎

غنچۂ نو دمیدہ کو جیسے نسیم گدگدائے
دیکھ جمال یار کو جیسے حیات مسکرائے

اسی عشق کے دوران میں فراق بہت بیمار ہو کر ہسپتال چلے گئے، بیماری کا شدید غلبہ اور اس پر غم عشق، بیماری اور غم عشق..... دونوں نے مل کر گویا سازش کر لی تھی، کہ اس سخت جان کو ٹھکانے لگا کر ہی دم لیں گے، ڈاکٹر مایوس ہو گئے اور فراق کے محبوب تک یہ خبر پہنچ گئی کہ بیمارِ عشق جاں بلب ہے۔ انجام کار محبوب نے آخری درشن دینے کی ٹھان لی جب محبوب عیادت کے لئے ہسپتال پہنچا، تو فراق نے اپنے محبوب کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا، جان میں جان آئی اور جینے کی تمنائیں مچلنے لگیں، محبوب کا دیدار کیا ہوا، موت کو شکست ہو گئی اور زندگی کامران نکلی، اسی عالم میں وہ بستر پر بیٹھے ہوئے شعر کہنے لگے اور "شامِ عیادت کے محبوب کے نام" ایک نظمِ طویل تخلیق ہوئی۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

یہ کون آنکھ مجھ پہ پڑ رہی ہے اتنے پیار سے
وہ بھولی سی یاد سی کہانیاں لئے ہوئے

یہ کس کی مہکی مہکی سانسیں تازہ کر گئیں دماغ
شبوں کے راز شبنموں کی نرمیاں لئے ہوئے

مجھے جگا رہا ہے موت کی غنودگی سے کون
نگاہوں میں سہاگ رات کا سماں لئے ہوئے

ہری بھری رگوں میں وہ چہکتا بولتا لہو
وہ سوچتا ہوا بدن خود اک جہاں لئے ہوئے

ترے نہ آنے تک اگرچہ مہرباں تھا اک جہاں
میں رو کے رہ گیا ہوں سو غم نہاں لئے ہوئے

اس جنتِ نظارہ کی اور جھلکیاں دیکھئے، جس میں روش روش پر محبوب کا روپ لہلہاتا نظر آتا ہے۔

ماتھے پہ ترے صبح چمن کھیل رہی ہے
آنکھوں میں محبت کی کرن کھیل رہی ہے

پیراہن خوش وضع سے آتی ہے لپٹ سی
ملبوس میں خوش بوئے بدن کھیل رہی ہے

یہ رنگ سخن ہے کہ معطر ہے سماعت
ہر لفظ میں خوشبوئے دہن کھیل رہی ہے

یہ شاعری نہیں بلکہ ایک کائناتِ جمال ہے۔

رس میں ڈوبا ہوا لہراتا بدن کیا کہنا
کروٹیں لیتی ہوئی صبح چمن کیا کہنا

مدھ بھری آنکھوں کی افسوں نظر پچھلی رات
نیند میں ڈوبی ہوئی چندر کرن کیا کہنا

جس طرح جلوۂ فردوس ہواؤں سے چھنے
پیرہن میں ترے رنگینیٔ تن کیا کہنا

دل کے آئینہ میں اس طرح اترتی ہے نگاہ
جیسے پانی میں اتر جائے کرن کیا کہنا

زلفِ شبگوں کی چمک پیکرِ سیمیں کی دمک
دیپ مالا ہے سرِ گنگ و جمن کیا کہنا

یہ حقیقت ہے کہ فراق کے سوز و گداز میں وہ درد پنہاں ہے، جو انسان کو انسان بنا دیتا ہے۔ یہ چند متفرق شعر ملاحظہ ہوں جو اسی محبوب کی دین ہیں:

کسی کی بزمِ طرب میں حیات بٹتی تھی
امید واروں میں کل موت بھی نظر آئی

تاریکیاں چمک گئیں آوازِ درد سے
میری غزل سے رات کی زلفیں سنور گئیں

زندگی کیا ہے اسکو آج اے دوست
سوچ لیں اور اداس ہو جائیں

زندگی کو بھی منہ دکھانا ہے
رو چکے تیرے بے قرار بہت

ازل کی صبح سے ہس عشق کا نہ راز کھلا
جو شہر شہر ہے بدنام کو بہ کو رسوا

ریاضِ دہر میں بوئے نشاط پھیل گئی
نہالِ غم کے بھی کیا کیا گل دمشر سے نکلے!

کہاں کا وصل، تنہائی نے شاید بھیس بدلا ہے
ترے دم بھر کے آجانے کو ہم بھی کیا سمجھتے ہیں

محبت میں مری تنہائیوں کے ہیں کئی عنواں
ترا آنا، ترا ملنا، ترا اٹھنا، ترا جانا

"روپ" کی رباعیاں بھی اسی دور کی تخلیق ہیں۔ ان رباعیوں میں فراق نے نئی جدت پیدا کی ہے۔ اب تک اردو میں جتنی رباعیاں لکھی گئی ہیں وہ فارسی رباعیوں سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں، فراق نے اس صنفِ سخن میں ایک نئی راہ اختیار کی ہے۔ انہوں نے رباعی کے قالب میں ہندو کلچر کی روح پھونکی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طریقِ فکر میں سنسکرت کی اصطلاحوں، تلمیحوں، بندشوں اور ترکیبوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ چنانچہ فراق نے اردو رباعیوں میں سنسکرت اصطلاحوں اور لفظوں کا استعمال شروع کیا، جو ہمارے لئے نامانوس تھیں۔ یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ ہمارے کان چونکہ سنسکرت کی اصطلاحوں اور ترکیبوں سے نا آشنا تھے اس لئے چند لوگوں نے شور مچایا کہ فراق سنسکرت کی سنگلاخ ترکیبوں کو اردو میں مروّج کر کے اردو دشمنی کر رہے ہیں یا اردو زبان کو بگاڑ رہے ہیں۔ یہ سب سطحی اعتراضات ہیں جن میں کوئی وزن نہیں، اگر سنسکرت الفاظ اور ترکیبوں کے استعمال کو ہم اردو دشمنی سے تعبیر کریں تو دارالترجمہ حیدرآباد کی شائع کردہ پوری کتابوں کو اردو دشمن قرار دینا ہوگا جن عربی اور فارسی کے ثقیل الفاظ و تراکیب کی بھرمار ہے۔ جن سے ہم اور ہمارے کان بالکل نا آشنا ہیں، یہ فراق کا اردو ادب پر احسان ہے کہ انھوں نے اردو زبان کی ترقی اور ترویج کا ایک نیا باب کھولا۔

"روپ" کی ساری رباعیاں محبوب کے جمال سے متعلق ہیں۔ ان میں محبوب کے خد و خال کی فنکارانہ عکاسی کی گئی ہے۔ یہاں شاعری میں مصوری کی شان پیدا ہو گئی ہے چند رباعیاں ملاحظہ ہوں ؂

مہتاب میں سرخ انار جیسے چھوٹے
یا قوسِ قزح لچک کے جیسے ٹوٹے

وہ قد ہے کہ بھیرویں سنائے جب صبح
گلزارِ شفق سے نرم کونپل پھوٹے

عیسیٰ کے نفس میں بھی یہ اعجاز نہیں
تجھ سے چمک اٹھتی ہے غنام کی جبیں
ایک معجزۂ خموش طرزِ رفتار
اٹھتے ہیں قدم کہ سانس لیتی ہے زمیں

خاموش نگاہوں کے تکلم کی قسم
اس سازِ جمال کے ترنم کی قسم
کلیاں سی چٹک رہی ہیں سینہ میں تمام
مہکے ہوئے شبنمی تبسم کی قسم

لہروں میں کھلا کنول نہائے جیسے
دوشیزۂ صبح گنگنائے جیسے
یہ روپ یہ لوچ یہ ترنم یہ نکھار
بچہ سوتے میں مسکرائے جیسے

رس میں ڈوبی تو اور نکھرتی شوخی
دھل کے شبنم سے جیسے کھلتی ہو کلی
معصوم ہے کتنی روٹھ جانے کی ادا
آنکھوں میں سرشک اور ہونٹوں پہ ہنسی

لہرائے سروں سے سر کے آنچل
منڈلائے گیسوؤں کے کالے بادل
یہ کس نے پریم کے ترانے چھیڑے
روشن ہوتے چلے جاتے ہیں گالوں کے کنول

فراق نے اردو ادب کو کئی نئی چیزیں دی ہیں۔ فراق کی شاعری نہ نشاطیہ ہے نہ خالص المیہ بلکہ وہ ان دونوں کا ایک ..... عجیب و غریب امتزاج ہے۔ ایک غزل کے مندرجہ ذیل چند اشعار میرے اس تاثر کی تائید کریں گے۔

پھر آج اشک سے آنکھوں میں کیوں ہیں آئے ہوئے
گزر گیا ہے زمانہ تجھے بھلائے ہوئے
جو منزلیں ہیں تو بس رہروانِ عشق کی ہیں
وہ سانس اکھڑی ہوئی پاؤں ڈگمگائے ہوئے
یہ نرم نرم ہوائیں ہیں کس کے دامن کی
چراغِ دیر و حرم بھی ہیں جھلملائے ہوئے
یہ حسرتیں ہیں کہ مایوسیاں کہ یاد تیری
کچھ ایسے دلِ افسردہ پر ہیں چھائے ہوئے
دبی ہیں رونقِ ہستی دبی ہیں جانِ نشاط
اداس بیٹھے ہیں جو تیری لو لگائے ہوئے
دلِ حزیں تری مایوسیاں قیامت ہیں
سکوتِ ناز ہے صد پیچ و تاب کھائے ہوئے
نہ جانے کیا یہ فسردہ دلوں کو سوجھی ہے
کہ چار سمت ہیں اک آگ سی لگائے ہوئے

مقدروں کے بگڑنے سے تجھ کو کیا لیکن — یہ کام کس نے بگاڑے بنے بنائے ہوئے
یہ شادکام محبت، یہ رازدار نشاط! — یہ لوگ اپنے لہو میں ہیں کیوں نہائے ہوئے
ہوا نہ جن کی کبھی پاسکیں حیات و ممات — دلوں میں ایسے بھی کچھ درد ہیں سمائے ہوئے
فراق تو ہی مسافر ہے تو ہی منزل ہے — کدھر چلا ہے محبت کی چوٹ کھائے ہوئے

بالآخر فراق کا یہ دورِ محبت بھی ختم ہوگیا۔ "شام عیادت" کے محبوب کا عشق بڑا زبردست تھا۔ فراق کو اس محبوب سے انتہائی عشق تھا مگر مجبوراً جدائی اختیار کرنی پڑی دوسرے عشق تک فراق اس محبوب کو بھولنے یا یاد کرنے میں دن گذارتے رہے۔ ان کا موجودہ رومان ۱۹۵۰ء میں شروع ہوا، خود ان کے قول کے مطابق یہ رومان شدید ہونے کے بجائے گہرا اور خاموش ہے، اس طرح ان کی ۱۹۵۰ء کے بعد کی شاعری میں ایک قسم کا اعتدال آگیا ہے اور گہری سنجیدگی پیدا ہوگئی ہے شاید یہ ان کی عمر کا بھی تقاضہ ہے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد فراق نے جو کچھ لکھا ہے وہ مختلف رسائل میں پھیلا پڑا ہے جس کے مطالعہ سے ہمیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ فراق کے ہم عشق میں جذبات کی وہ ہیجانی کیفیت نہیں ہے جو اس سے قبل کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ اس دوران میں انہوں نے طویل نظمیں لکھی ہیں اور طویل غزلیں بھی، اپنی نظموں میں وہ مارکسی عقائد کو سمونے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ وہ غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ غمِ دوراں کو بھی سینے سے لگائے پھرتے ہیں، مگر وہ فطرتاً عاشق ہیں، اسی باعث ان کی شاعری بھی خالص عشقیہ شاعری ہے۔ انھوں نے اپنی توجہ کو غمِ دوراں کے کئی مسائل پر مبذول کرانا چاہا، مگر ان کے جذبات پر غمِ عشق ہی حاوی رہا۔ ان کی طویل غزلوں میں غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ غمِ دوراں کا ذکر بھی ہوتا ہے، مگر اس کے باوجود غمِ دوراں میں وہ سوز و گداز نہ پیدا کر سکے جو کہ ان کی عشقیہ شاعری میں ہے۔ ہم کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہر بڑا شاعر ہمیشہ بلند تخلیقات ہی پیش کرتا ہے۔ یہ ناممکن بات ہے اسطرح فراق سے یہ امید رکھنا کہ ان کی ہر غزل یا غزل کا ہر شعر بلند پایہ ہوگا، بعید از قیاس ہے کسی شاعر کی کلیات لے کر ہمیں سے اچھے شعر چھانٹ کر یہ کہدینا کہ اس شاعر کے اتنے شعر اچھے ہیں باقی فضول یا بیکار ہیں... تنقید نہیں ہے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ شاعر نے کیا نئی بات پیدا کی ہے، جو دوسروں نے نہیں پیدا کی، شاعر نے زبان کو کیا کیا نئی چیزیں دی ہیں اس کی نگارشات سے ادب میں اضافہ ہوا ہے یا اس نے صرف آموختہ دہرایا ہے۔

اگر تنقید کے ان اصولوں پر فراق کی شاعری کو پرکھیں تو ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے "کہ فراق نے اردو کو صرف نئے الفاظ، نئی تشبیہیں، نئی اصطلاحیں ہی نہیں دی ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر فراق نے اردو شاعری کو عشق کا ایسا تصور بخشا ہے جس میں ہمیں دیوتیت کی جھلک نظر آتی ہے"۔

اتنی بات تو ہر نقاد مانتا ہے کہ اردو شاعری میں لب لہجہ کی نرمی کا جو اضافہ فراقؔ نے کیا ہے وہ یقیناً ہمارا انمول سرمایہ ہے، ہم اس پر جس قدر ناز کریں بجا ہے۔ غنائی کیفیت اور اعلےٰ تفکر نے ان کی شاعری کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا ہے۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ فراقؔ کے عشق میں دیوتائیت کی جھلک پائی جاتی ہے۔ میں جب بھی فراقؔ کی شاعری کا مطالعہ کرتا ہوں تو کرشن جی کے عاشقے یاد آجاتے ہیں۔ کرشن کنہیا اور فراقؔ میں کئی باتوں کی مماثلت پائی جاتی ہے۔ کرشن جی نے بھی کئی عشق کئے تھے مگر فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ہمیشہ ہی خوش بنے رہے اور دیوتا مانے گئے۔ کرشن جی نے "بھگوت گیتا" کے ذریعہ ایک فلسفۂ حیات پیش کیا۔ میں یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ فراقؔ نے "بھگوت گیتا" جیسی چیز پیش کی ہے البتہ اتنا ضرور ہے کہ فراقؔ نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ ادبِ عشق کا بہترین سرمایہ ہے۔ فراقؔ نے ریاض خیرآبادی پر ایک مقالہ سپردِ قلم کرتے ہوئے ریاضؔ کو "کرشن کنہیا" تحریر کیا ہے۔ میں آج یہی جملہ فراقؔ سے مستعار لیتا ہوں اور کہتا ہوں کہ فراقؔ بھی ہمارے ادب کا "کرشن کنہیا" ہے۔"

★

واجدہ تبسم

"رقیبِ روسیاہ"

ہاسپٹل کے صاف ستھرے برانڈے میں حامد میاں بولائے بولائے سے پھر رہے تھے۔ کبھی وہ پنجوں کے بل اونچا ہو کر شیشے کی کھڑکیوں میں سے جھانکنے کی کوشش کرتے اور کبھی دروازے کی درز سے آنکھ لگا دیتے ۔۔۔ اور پھر مایوس ہو کر ٹہلنے لگ جاتے ۔۔۔

"اللہ جانے کب وہ خوش خبری ہم تک پہنچتی ہے" وہ پھر ٹہلنے لگ گئے۔۔ "ہے گاڈ بلس ہر"۔۔۔

پاس پڑے بنچ پر بیٹھے ہوئے اکبر میاں سکون سے بولے ۔۔ "ارمیاں پریشانی کی کون بات ہے ۔۔ پہلی زچگی ہے، گھنٹوں کا ذکر ہی کیا، دو دو تین تین دن ٹوٹ جاتے ہیں اور مہربان برآمد نہیں ہوتے ۔۔ یوں حواس باختہ ہونے کی کیا بات ہے" ۔۔؟

حامد میاں چڑ گئے ۔۔ "وہاٹ نان سنس ۔۔! ارے مسٹر پانچ سال بعد یہ دن دکھایا ہے خدا نے ۔۔ اور تم کہتے ہو حواس باختہ ہونے کی کیا ضرورت ہے ۔۔؟ اب کیا بتاؤں میں کس قدر وریڈ ہوں" ۔۔؟

"تم وریڈ ہو تو ہم بھی کچھ گلیڈ تو نہیں ہیں۔ ایسے معاملوں میں جلدی نہیں ہوا کرتی چین سے بیٹھو"۔

مگر حامد میاں چین سے نہیں بیٹھے ۔۔ ٹہلتے ہی رہے۔

اکدم میٹرنٹی روم سے چیں چیاں کی آواز سنائی دی۔۔ حامد میاں اچھل پڑے۔

"میں سمجھتا ہوں بے بی پیدا ہو گیا"۔۔

اکبر میاں اسی سنجیدگی سے بولے ۔۔ "آپ کیسے سمجھ بیٹھے کہ آپ ہی کی اولاد کی

چیخ ہے ۔۔۔ ارے میاں کیا اتنے بڑے ہاسپٹل میں ایک ہی عورت زچگی کے لئے آئی ہو گی ۔؟ اگر ہمارا بے بی ہوتا تو اندر سے بوا یا مہری کوئی بھی لپکی چلی آتی"۔۔۔

حامد میاں جلدی جلدی بے قراری سے ٹہلنے لگے ۔۔۔ اکبر میاں مذاق سے بولے ۔۔۔

"میاں ۔۔۔ دردِ زہ تمہیں لگے ہیں یا تمہاری بیوی کو"۔۔۔؟!

حامد میاں جلدی سے قریب آ گئے ۔۔۔ "کیا کہا ۔۔۔ کیا ہوا وائف کو"؟

"نہیں میں پوچھ رہا تھا زچگی تمہاری ہو رہی ہے یا تمہاری بیوی کی"۔۔۔؟

"لاحول ولا ۔۔۔ یہ کون مذاق کا موقع ہے ۔۔۔؟ بائی گاڈ بالکل بے تکے آدمی ہو"۔۔۔!

اب ان سے صبر نہیں ہو پا رہا تھا ۔۔۔

"دیکھو اُدھر چلتے ہیں، میٹرنٹی روم کے پچھواڑے ۔۔۔ وہاں سے جھانکیں گے ذرا ۔۔۔ یہ سامنے والے شیشے تو دودھیا ہیں۔ یہاں سے کچھ نظر آنا بالکل اِم پاسبل ہے"۔۔۔

"دیکھو میاں ۔۔۔ اکبر میاں ٹھنڈے لہجے میں بولے ۔۔۔ "تم پہلے ذرا اپنی ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرو ۔۔۔ پتلون کا بلٹ نکال پھینکو ۔۔۔ کوٹ کے بٹن کھول دو، پھر آپ ہی آپ سکون مل جائے گا ۔۔۔ عجیب پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہے ہو ۔۔۔ اس وقت صورت سے بیرسٹر نہیں، احمق معلوم ہو رہے ہو"۔۔۔

"بیرسٹری کو ڈالو چولہے میں ۔۔۔ اس وقت تو حالت تباہ ہے ۔۔۔ اُف ۔۔۔ مائی گاڈ ۔۔۔ پتہ نہیں کب ڈلیوری ہو"۔۔۔

"توبہ ۔۔۔ میں نے کسی باپ کو اتنا بدحواس نہیں دیکھا"۔۔۔

"یوں کہو کسی عورت کو اتنا ڈیلی کیٹ نہیں دیکھا ۔۔۔ عطیہ جیسی عورت کو تو کانٹا چبھ جائے اس کی بھی برداشت نہیں اور یہ تو اتنے بڑے چائلڈ کو برتھ دینے کا سوال ہے"۔

"تو عطیہ بی بی کون سی دنیا سے نرالی ہیں ۔۔۔؟ ارے میاں دھان پان، ماچس کی تیلی ایسی عورتوں کو ہم نے مزے سے نو، نو، دس، دس پونڈ کے بچے جنتے دیکھا ہے ۔۔۔ ارے بھائی تخلیق کا یہی انداز ہے، اس میں گھبرانے یا پریشان ......

ابھی ان کی بات پوری بھی نہ ہو پائی تھی کہ سفید کپڑوں میں سیاہ فام نرس

رپ رپ کرتی آئی اور اپنے سفید دانت چمکا کر بولی

"ہیڈ سٹر صاحب۔۔ مبارک........"

ابھی اس کی بات پوری بھی نہ ہو پائی تھی کہ پیلا لہنگا جھلاتی اور کاسنی کے کپڑے بجاتی مہری لپک آئی اور دُور ہی سے چلّا کر بولی ۔۔۔

"بے سرکار ۔۔۔ بہو صاحب نے گورا گٹھا بیٹا جنا ہے"۔۔ !

"اوہ گاڈ ۔۔۔ حامد میاں خوشی سے اچھل پڑے ، نرس کو نظر انداز کرکے مہری کی طرف لپکے اور سن لینے کے باوجود دوبارہ چلّا کر پوچھا ۔۔ "کیا کیا۔ کیا ......

"بیٹا ۔۔ بیٹا ۔۔ بیٹا ۔۔ مرد بچہ"۔۔ وہ ہنس کر بولی اور دھپ دھپ پیر پٹختی گھیر دار لہنگے کو جھلاتی ، پھر میٹرنٹی روم کو بھاگ گئی ۔

نرس نے ناگواری سے اسے دیکھا ۔۔ "اتنی بار کہا ہاسپٹل میں اتنا شور نہیں مچانا چاہیئے دوسرے مریضوں پر بُرا اثر پڑتا ہے"۔۔ !

حامد میاں نے خوشی سے اچھلتے ہوئے اکبر میاں کے کندھے پکڑ لئے ۔۔

"سنتے ہو بھیا ۔۔ بے بی سن ۔۔ مطلب ہے وائٹ روز"۔

اکبر میاں بولے ۔۔۔ "ہاں ہاں وہ تو ہے ، مگر ذرا نرس کو اس کا حق تو پہنچا دو ، دیکھتے نہیں وہ منہ بنا رہی ہے ، مہری نے اس کا حصہ لوٹ لیا"۔۔

"یہ بات ہے"۔ ! حامد میاں نے جیب سے دس کا نوٹ نکالا۔ "اٹ از تھینک فار یو ۔۔ مگر لے لو"۔۔ وہ نرس کے ہاتھ میں نوٹ ٹھونسنے لگے ۔۔

نرس نے پہلے تو ذرا آنا کانی کی اور اپنے پچھلے رویئے پہ شرمندہ ہوتی ہوئی بولی ۔

"در اصل یہ آپ کی مہری ہے نا ۔۔ بہت خوش مزاج اور طرار ہے ۔۔ دیکھئے نا دیکھتے ہی دیکھتے سارے ہاسپٹل سے دوستی کرلی ہے اس نے ۔۔ پیر پٹخ پٹخ کر بھاگنے کا تو اسے بے حد شوق ہے"۔۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنسنے لگی ۔

مگر حامد میاں اس کی بے رس باتیں نہیں سن رہے تھے ۔ اکبر میاں کا بازو گھسیٹ کر بول رہے تھے ۔۔

"بھیا اندر چلو ۔۔ پلیز جلدی ۔۔ میں بے بی کو دیکھنے اس قدر بے چین ہو رہا ہوں

پلیز بی کو نیک "۔

"کمال کی بات کرتے ہو میاں! ۔۔۔ بھلا کون تمہیں اتنی جلدی اندر گھسنے دیگا۔؟ ابھی تو نرسیں بچے کو نہلانے کے لئے لے گئی ہوں گی اور پھر ابھی .... وہ چپ ہو گئے۔ پھر بول اٹھے ۔" ایسی بھی کیا بے صبری ۔۔۔ پانچ سال صبر کیا اور اب پانچ منٹ نہیں ہوتا"

" وہی تو خاص بات ہے ۔ اب تو بس انتہا ہو چکی ہے، بھئی ہم چل دیئے، اب بالکل ویٹ نہیں کر سکتے۔ اتنی دیر تو ہو گئی "۔

ہاسپٹل میں سب سے زیادہ کرایہ والا روم لے رکھا تھا مہر ہے آدمی تھے اور ہاتھ کھلا ہو تو سب کے منہ بند ہو جاتے ہیں ۔ وہ دھڑ دھڑاتے اندر داخل ہو بھی گئے مگر کسی نے منع نہیں کیا۔ میٹرنٹی روم سے عطیہ کو پرائیوٹ روم میں لے جایا جا چکا تھا ۔ وہ سیدھے وہیں پہنچ گئے ۔

عطیہ پلنگ پر سفید چادر لپیٹے مسکراتی پڑی تھی۔ پائنتی کی طرف سفید پالش کیا ہوا چھوٹا سا جھولا لٹک رہا تھا ۔ حامد میاں نے بڑی خوشی سے ہنستے ہوئے جھولے پر سے جالی ہٹائی ۔

" او مائی گاڈ ۔۔۔ ہاؤ ٹائنی کریچر ۔ کس قدر منا سا ہے "

" منا سا کاہے کو ہے " عطیہ غرور اور ناز سے بولی ۔ " پورے ساڑھے نو پونڈ کا ہوا ہے "

حامد میاں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا ۔

" وہاٹ ۔ ؟ ساڑھے نو پونڈ ۔ مگر تم اس قدر نازک ہو سو ڈیلی کیٹ۔ یہ سب کچھ ہوا کیسے " ؟؟

" ہش " عطیہ شرما گئی ۔۔۔

" تمہیں قسم ہے سچ سچ بتا دو ۔ یہ پیدا کیسے ہو گیا ؟ اور تم اس قدر خوش اور بلبلیں منظر آ رہی ہو ۔ کسی قسم کی ویکنس نہیں ہو رہی ہے تمہیں " ؟ وہ مارے حیرت کے سوال پر سوال کئے جا رہے تھے ۔

مہری باہر سے سفید نواروں کا بڑا سا گٹھا سنبھالے آئی اور اترا کر بولی

"سرکار بی بی لوگ اُدھر ہی انتجار دیکھتی بیٹھی ہیں۔ جرا انہیں بھی کھُش ہونے دیں۔"

علیہ نے شرمائی سی ہنسی کے ساتھ کہا ــــ "سچ بھئی آپ ایسے جلدی چلے آئے ــــ بس ابھی ابھی تو مجھے یہاں لائے تھے ــــ ممی بجیا، ثریا انٹی تو اُدھر ہی بیٹھی رہ گئیں۔"

"اور سرکار سب سے بڑھ کر تو چھوٹی بی بی لوگ اودھم مچا رہی ہیں مگر بڑی سرکار نے مناہی کر دی ــــ بولیں ــــ ابھی نہ جاؤ بڑی جھوکریو ــــ اُدھر راج ونیاج ہو رہے ہیں" وہ مٹک کر، اترا اترا کر ہنسنے لگی ــــ

سرکار نے ٹیڑھا سا منہ بنایا مگر آج علیہ کے لئے مہری کی ہر خطا، ہر بدتمیزی قابلِ معافی تھی ــــ

"سنا سرکار نے" ؟ علیہ ہنس کر حامد میاں سے مخاطب ہو گئی! اس کے ہر انداز سے غرور ٹپک رہا تھا ــــ

"تم اپنی سویٹ ہوڈارلنگ ــــ وہ بے تابی سے بولے ــــ تم نے مجھے باپ بنا دیا ــــ میں کس قدر خوش ہوں ــــ سویٹی"!!

"اچھا" ! علیہ خوشی خوشی عام ماؤں کے سے انداز میں بولی" بچے کا نام کیا رکھیں گے" ؟؟

"ہاں بھئی کیا رکھیں گے ــــ کوئی اچھا سا ــــ نولی سا نیم ہونا چاہئے ــــ تم نے کچھ سوچا ہے ــــ ؟ بھلا ٹونی رکھ لیں تو" ؟

"ٹونی" ؟ علیہ نے اک دم سے انکار کر دیا" اونہوں ــــ وہ مائیکل صاحب کے بیٹے کا یہی نام ہے ــــ کم بخت جب دیکھو تب بسورا کرتا ہے ــــ ہمیں نہیں بھاتا ایسا نام۔"

"تو وکی رکھ لیں ــــ ؟ بھلا خاصا ہے۔"

"نا بھئیا ــــ انکل کے چھوٹے بیٹے کا نام ہے ــــ انہیں بخار چڑھے گا۔ کہیں گے ساری دنیا میں بس یہی ایک نام رہ گیا تھا" ــــ ؟

سوغات

"لالی — ارے لالی رکھ لیں تو — ہاؤ ونڈرفل"— !

عطیہ کی ہنسی چھوٹ گئی —

"ہائے یہ تو بالکل لڑکیوں کا سا نام ہے اور ہمیں تو بے بی ہوا ہے"— وہ منہ سے بولی— "اچھا جی — اگر جیکو رکھ لیں تو"— ؟

"جیکو — ! ویری نائس — ویری بیوٹی فل — بہت اچھا نام ہے عطی ڈارلنگ — مگر کوئی اعتراض کرے تو"— ؟

عطیہ ناک چڑھا کر بولی — "واہ بھئی بچہ ہمارا ہے کوئی اعتراض کیوں کرنے لگا؟"

اکدم باہر سے پیں پیں آواز آنے لگی — عابد میاں بڑا سا منہ بنا کر بولے

"اُف کس قدر بور ریٹ ہے — دیکھو ہارن پہ ہارن بجائے جا رہا ہے ایڈیٹ"

"تو ابھی جانے کی جلدی بھی کیا ہے"— عطیہ لگاوٹ سے بولی — آج تو اس کا جی چاہتا تھا کہ بس باتیں ہی کئے جائے۔

"شام ہی ڈنر اٹنڈ کرنا ہے عطی ڈارلنگ — اور میں اس قدر بور ہو رہا ہوں — بھلا تمہارے اور جیکو کے بنا اب کہاں دل لگے گا"— ؟

"بھئی کس نے انوائٹ کیا ہے"— عطیہ بسور کر بولی۔

"رحمان صاحب نے — ان کے بیٹے کا برتھ ڈے ہے نا آج"—

"اور جو ہمارے بیٹے کا برتھ ڈے ہے آج"— عطیہ ناز سے بولی۔

"مگر ڈارلنگ میں نے پرامس جو کر لیا ہے"—

"جائیے بھی آپ تو اکدم ویسے ہیں — ساری تو باتیں کیا کرتے تھے۔ یہاں سونا، ووں ہوگا اور بس چلے جا رہے ہیں"—

مہری پھر نمودار ہو گئی —

"سرکار، وہ کالی سسٹر ابھی جھانک گئی ہے — کہہ رہی تھی اتنی باتیں نہیں کرنی چاہئیں — چین سے سو جائیے"—

سرکار نے ہنس کر عطیہ کی طرف دیکھا —

"بھئی سچ تمہیں ریسٹ کرنا چاہئے"— وہ مسکرائے اور پھر بے بی پر جھک گئے

"ڈارلنگ تم اسے دودھ نہیں پلاؤ گی ۔۔؟ وہ بدمعاشی سے بولے ۔۔
"ہٹیے بھی ۔۔ آپ تو یوں ہی شرارت کرتے ہیں"۔ علیہ شرما گئی اور وہ ہنسنے لگے ۔۔ ان کی آنکھوں میں ہنسی تھی۔ چہرے پر ہنسی تھی، ہونٹوں پر ہنسی تھی، لہجے میں ہنسی تھی اور پیار ۔۔ پیار ہی پیار ۔۔
علیہ نے رک کے کہا ۔۔
"ہماری زندگی پہلے ہی کیا کم حسین تھی، اب تو حسین تر ہو جائے گی ۔۔ سدا بہار ہو جائے گی۔" "اف! آپ مجھے اس قدر چاہتے ہیں"۔ شرم اور مسرت سے اس کا منہ تمتما گیا اور آنکھیں گیلی ہو گئیں۔

• • • ● • • •

دس دن ہسپتال میں ہی گذرے ۔۔ گیارھویں دن ہی علیہ اپنے تندرست اور سفید گلابی بچے کو لے کر گھر لوٹ آئیں ۔۔ حامد میاں بیرسٹر تھے، ولایت پلٹ ۔۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور امیر گھرانا ۔۔ شادی بھی اچھے گھرانے میں ہوئی ۔۔ علیہ بی اے پاس تھی، باپ ڈاکٹر تھے، ہزاروں میں کھیلی ہوئی ۔۔ تعلیم بھی اچھی ملی، صورت شکل بھی پیاری پیاری ہی ۔۔ جوڑ کو جوڑ ملا ۔۔ میاں بی بی دونوں نے کانونٹ میں تعلیم پائی تھی ۔۔ تھے تو مسلمان اور ہندوستانی، مگر گھر میں زیادہ تر مغربیت ہی تھی ۔۔ جب مزاج سے مزاج اور دل سے دل ملے تو پھر کیا کہنا ۔۔؟ میاں بی بی ایک دوسرے پر پروانہ وار نثار تھے ۔۔ شادی کو سات آٹھ سال گذر گئے تھے ۔۔ شادی کے کوئی دو سال بعد ایک حمل ساقط ہوا۔ پھر اس کے بعد، اب کوئی پانچ سال بعد خدا نے گود بھری کی ۔۔ اب زندگی کی خوشیوں میں کس بات کی کمی تھی ۔۔؟ بس چیکو میاں ہیں اور زندگی ہے۔
چیکو میاں کو انگوٹھا چوسنے تک کی تمیز نہ تھی مگر ماں باپ دادا دادی، نانا نانی نے کھلونوں سے گھر بھر دیا ۔۔ دیکھ بھال کے لئے انگریز گورنس مقرر کی گئی ۔۔ بچپن سے ہی انگلش بول چال کانوں میں پڑے گی تو شروع سے ہی ماں باپ کے رنگ میں رنگے جائیں گے ۔۔ بات کرنا تو دور رہا ابھی ہگنے موتنے کی بھی سدھ نہ تھی مگر گورنس انہیں سنائے جاتی ۔۔

"ہلو — ہاؤ ڈو یو ڈو مسٹر چیکو"؟

مسٹر چیکو اپنا گلیھا ایسا منہ پھاڑ کر ہنسنا شروع کر دیتے، یا روتے کی جون میں ہوتے تو لال لال ہاتھ پاؤں ہلا ہلا کر چیں چیں شروع کر دیتے —

یوں تو حامد میاں کی آمدنی ہزاروں سے تھی۔ باپ کے گھر میں بھی کیا کمی تھی —؟ یہاں کوٹھی میں نوکروں کا بازار تھا۔ ہاتھ ہاتھ کو، پاؤں پاؤں کو نوکر تھے۔ ایک کو بلاؤ چار دوڑ پڑتے — اشارہ پاتے ہی دل بچھا دیتے۔ مگر عطیہ حامد میاں کا ہر ہر کام اپنے ہی ہاتھوں کرتی — باہر جانے کے لئے اٹھتے تو کوٹ خود پہناتی، ٹائی خود باندھتی۔ لاکھ منع کرتے کے باوجود جوتوں کے بند تک خود باندھ دیتی — غلام رسول پیچھے پیچھے برش لئے دوڑا آتا تو اس کے ہاتھ سے برش لے لیتی —" تم جاؤ — میں کر لوں گی"۔

جوتوں کو پالش کرنے میں بھی عطیہ کو مزہ آتا — جیسے دفعتہً دونوں کی پیار بھری نوک جھونک ہوئی ہو گی۔

"اف عطی ڈارلنگ تم ذرا اپنی اور میری پوزیشن کا تو خیال کیا کرو — بھلا لوگ کیا سوچتے ہوں گے کہ ایک بیرسٹر کی بیوی، ایک ڈاکٹر کی بیٹی، اتنے بڑے گھر کی بہو اور یوں جوتوں کو پالش کرتی پھرے — آئی کانٹ بیر اٹ"۔

عطیہ کا جواب صرف ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہوتا۔

اسی پر بس نہیں — بیرسٹر صاحب کے لئے کھانے کی الگ میز لگتی تھی، کیونکہ ان کا ٹائم سب کے ٹائم سے میل نہ کھاتا تھا — یوں ڈائننگ ٹیبل ارینج کرنے کے لئے ایک سے ایک نوکر تھا۔ مگر عطیہ ہر ہر ڈش اپنے ہاتھوں سلیقے سے رکھتی، جگ سے پانی انڈیلتی اور جب تک یہ کھانا کھائیں میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتی رہتی۔

بڑے بوڑھے کہتے ہیں — جہاں پھول نہیں وطن بہار نہیں، جہاں بچہ نہیں وہاں پیار نہیں — مگر حامد میاں اور عطیہ میں بچہ نہ ہونے کے باوجود وہ پیار تھا کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی۔ یہ ضرور ہے کہ گھر میں بچے کی معصوم کلکاریاں نہ تھیں مگر پھر بھی بہار کوٹھی کے کونے کونے سے پھوٹی پڑتی — اور اب تو پوچھنا ہی کیا تھا —؟ حامد میاں اپنے دوستوں میں کہا کرتے —" بھئی ہماری ایسی لائف تو لسن تک سے کسی کسی کو مل جاتی ہے"

سوغات

حامد میاں باہر سے آئے، گاڑی پورٹیکو میں ٹھہرائی اور جلدی جلدی عطیہ کے پاس آکر بولے۔

"ڈارلنگ۔ بس اکدم سے جھٹ پٹ تیار ہو جاؤ۔"

"کیوں ۔۔؟ کس سلسلہ میں اتنی جلدی؟" عطیہ چیکو کو فراک بدلاتے ہوئے بولی۔

"اوہ ٹائم بالکل کم ہے۔ پلیز۔ جلدی۔"

عطیہ نے ڈبے سے پف نکال کر چیکو کے گالوں پر پوڈر تھوپا اور بولی۔ "سچ یہ پف اتنا سخت ہے اور چیکو کے گال اتنے نرم نرم۔ جانے ان لوگوں کو شاپنگ کرنی کیوں نہیں آتی۔"

حامد میاں چیکو پر جھک کر پیار کر کے بولے ۔۔ "ارے غلطی ڈارلنگ یہ گورنس کس لئے رکھی گئی ہے آخر۔؟ بائی گاڈ، جب دیکھو تب تم چیکو کے کام میں جتی رہتی ہو۔ کبھی کپڑے بدلا رہی ہو، کبھی باتھ دے رہی ہو، کبھی بوتل واشں کر رہی ہو کبھی ...... ارے میں پوچھتا ہوں یہ مہینے کے سو روپے یوں ہی بٹور لیتی ہے کیا۔"

"تو ہوا کیا۔" عطیہ بڑے پیار سے بولی۔ "کبھی کبھی یوں ہی جی چاہ جاتا ہے کہ چیکو گڈے کا منہ دھلا دوں بس دھلا دیتی ہوں، کبھی جی چاہ جاتا ہے کپڑے بدلا دوں بس بدلا دیتی ہوں۔"

حامد میاں ہنس کر بولے ۔۔ "اچھا اچھا دو چار مہینے میں سارا شوق ہوا ہو جائیگا پھر ایک ایک سے کہتی پھرو گی ۔۔ اف مائی گاڈ، کوئی تو اسے سنبھالو، مجھے سونے تک کی مہلت نہیں ۔۔ ارے کوئی تو اسے اٹھاؤ، مجھے باہر جانے کے لئے تیار ہونا ہے ..... اپنے کہنے پر خود ہی خیال آ گیا کہ ابھی ابھی وہ عطیہ سے باہر چلنے کو ہی کہہ رہے تھے ہڑبڑا کر بولے ۔۔

"اُف مائی گڈنس ۔۔ سکس ٹن تو ہو بھی گئے۔ بس پکچر شروع ہوتی ہی ہوگی۔"

"مگر کون جا رہا ہے پکچر ۔۔؟" عطیہ سے حیرت سے بولی۔

"ہم دونوں اور کون ۔۔؟" حیرت ہے جب سے یہی کہہ رہا ہوں، دیکھتی نہیں

ہیں نے کپڑے بھی اسی لئے نہیں بدلے کہ بس اکدم سے چل ہی دیں — بڑی فرسٹ کلاس انگلش پکچر لگی ہے"۔

علیہ نے چیکو کو اٹھا کر کندھے پر ٹکایا اور ایک ہاتھ سے حامد میاں کی تھوڑی پکڑ کر بولی —

"آپ ہی چلے جائیے نا۔ چیکو ابھی کھانس رہا تھا۔ میں ذرا اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی"۔

حامد میاں منہ سے کچھ نہ بولے۔ علیہ خود ہی بول اٹھی — "آپ دیکھتے ہیں، میں نے اتنے برس ہو گئے آج تک کبھی آپ کی کوئی بات نہیں ٹالی مگر اس وقت بے بی کی کھانسی ذرا کم ہے، بڑھ گئی تو مصیبت ہو جائے گی، پھر کبھی چلے جائیں گے ساتھ ساتھ۔ آج تو آپ اکیلے ہی دیکھ آئیے۔ جائیے نا — پلیز ورنہ دیکھئے ورنہ پکچر شروع ہو جائے گی۔

حامد میاں اکیلے ہی پکچر چلے گئے —

• • • • •

مسٹر چیکو اب پانچویں چھٹے مہینے میں تھے۔ صحت ماشاء اللہ ایسی تھی کہ کسی طرف سے دیکھو نو سوا نو فٹ بال کے اور کوئی تشبیہہ یاد نہ آتی — رنگ ایسا کہ سفید گلاب۔ اور چھ مہینے کے تھے مگر بلا مبالغہ ایک سال سے اوپر ہی نظر آتے — بات بے بات ہنستے جاتے۔ کوئی دھمکی دیتا تو گلابی گلابی ہونٹ نکال کر یوں بسورتے کہ سب کو بڑی طرح پیار آ جاتا — قہقہے لگانے کی اتنی گندی عادت پڑ گئی تھی کہ کوئی غصہ میں ہو یا نہ ہو جہاں کسی کو دیکھا اور لگے قیں قیں کرنے — چھ مہینے میں تو عام بچے سیدھی طرح بیٹھ بھی نہیں پاتے، چیکو میاں لنڈ منڈ فٹ بال۔ گھٹنوں کے بل گھسرتے چلے جاتے — گورنس کا ناک میں دم تھا — آ جا کے حامد میاں سے شکایت کرتی۔

"بیرسٹر صاب — چھوٹا صاحب بہوت ناٹی ہو گیا ہے۔ دن بھر میں کوئی ایک درجن سوٹ ڈرٹی کر ڈالتا ہے۔

بیرسٹر صاحب بڑے پیار سے بولتے —

"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں — ہم اور لے آئیں گے۔ بچے تو ناٹی ہی بھلے

علیہ بی نے اپنے کمرے کو درزی کی دکان بنا ڈالا۔ ایک سے ایک بڑھیا کپڑا۔ شفان جارجٹ، شنٹونگ، کریپ، امبوز، ٹیفٹا، ساٹن، اطلس، بس کمرے میں تھیلیاں لگی ہوئی ہے۔ کبھی جارجٹ کا جھگلا سِل رہا ہے تو کبھی شفان کی فراک، کبھی امبوز کے نکو شرٹ تو کبھی ساٹن کی چھوٹی سی اچکن ۔۔ پھر یہ کپڑے سِل جاتے تو بڑے پیار سے اس لڑھکتے ہوئے فٹ بال کو جا کر اٹھا لاتیں، نہلا دھلا کر کبھی چھوٹا سا کوٹ پتلون پہنا صاحب بہادر بنا دیتیں ۔۔ کبھی جھگلا پہنا کر کانور کا ہوا سا بنا دیتیں۔ یہ سب ہو جاتا تو پھر ململ کا ڈھیلی آستینوں کا چار کلی کا کرتا اور ہرک کا چست پاجامہ پہنا کر دلّی کا بانکا بنا ڈالتیں۔

اب علیہ بی کا دن کا آدھے سے زیادہ وقت چیکو کی دیکھ ریکھ میں ہی گذرا کرتا۔ اتنے ڈھیر سارے کام کبھی نہ اکتاتیں ۔ کبھی کپڑے سیتے سیتے ذرا دل اچاٹ گیا تو اون کے پھندے ڈالنے بیٹھ گئیں ۔۔ یوں بیرسٹر صاحب کون کمی کرتے تھے مگر ماں کا دل جو ٹھہرا۔ لال نیلے، گلابی، پیلے اون کے گولے کے گولے ادھر سے ادھر لڑھکتے پھرتے ۔۔ کبھی سویٹر تو کبھی موزے کبھی ننھی کوٹی تو کبھی ٹوپی ۔۔ علیہ بی کا کمرہ کوئی دیکھتا، بس عین مین نمائش گاہ بن کر رہ گیا تھا۔

اُس دن حامد میاں باہر جانے کے لئے اٹھے تو ٹائی ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر بیزار ہو گئے، یہاں وہاں کونے میں، ریک میں، ہینگر میں ۔۔ کہیں تو دکھائی دیتی ہے! علیہ وہیں گود میں چیکو کو لئے بیٹھی، ہنس ہنس کر اسے مٹھو کی طرح باتیں کرنا سکھا رہی تھی۔

"ہاں بولو بیٹے ۔۔ ڈے ۔۔ ڈی ۔۔ ڈے ۔۔ ڈی"

چیکو نے جواب، ایک سال کے رنگ ہمک ہو رہا تھا، اپنا گول گول منہ کھولا اور بولا

دا ۔۔۔۔ دا

علیہ کو ہنسی آ گئی ۔۔ "دادا نہیں ۔۔ ڈے ۔۔ ڈی"

چیکو پھر بولا ۔۔ دا ۔۔ دا ۔۔

حامد میاں جھلا کر بولے ۔۔ "ایک گھنٹے سے ٹائی ڈھونڈھ رہا ہوں اور ذرا دھیان نہیں دیتیں ۔۔ یہی وقت رہ گیا ہے باتیں سکھلانے کا ۔ نان سنس"۔۔

علیہ نے پیار سے میاں کو دیکھا اور بولی ۔۔ سچ دیکھئے تو کس مزے سے دا ۔ دا

کھسک رہا ہے "۔

چڑ کر بولے ۔۔ "کہتا پھرے، مجھے کیا ۔ مجھے دیر ہو رہی ہے، اف اٹھو بھی ۔
مائی گڈ نس ۔۔ دیکھو تو ابھی ناشتہ بھی نہیں لگا"۔

عطیہ چیکو کو مونڈھے پر ٹکا کر اٹھی ۔۔ ہلکی سی "اونہہ" کے ساتھ الماری تک گئی
اور ہینگر نکال کر بولی :-

" یہ کیا ٹنگ رہی ہے ٹائی "۔

ٹائی دے کر وہ دروازے تک گئی اور آواز دے کر بولی ۔۔ " کریم سرکار کے لئے
میز لگا دو"۔ اور واپس آ کر خود چیکو کو لے کر بیٹھ گئی ۔۔

" ہاں بیٹا بولو تو سہی ۔۔ مم ۔۔ می ۔ مم ۔۔ می ۔۔

" مام ۔۔ مام "۔ وہ منہ پھاڑ کر بولا اور بے بات دونوں ماں بیٹے زور
زور سے ہنسنے لگے ۔۔

حامد میاں نے ٹائی کی گرہ تنگ کرتے ہوئے ناگواری سے دونوں کو دیکھا اور ڈائننگ
ہال کی طرف چل دیئے ۔۔

جس دن پہلی بار چیکو نے "ڈیڈی" کہا عطیہ کا مارے خوشی کے بُرا حال ہو گیا ۔۔
آنکھوں میں مارے خوشی کے پانی اُمڈ آیا ۔۔

" اف دیکھئے تو ۔۔ لوگوں کے بچے تو تین تین سال کے ہو جاتے ہیں اور منہ ہلانا
تک نہیں آتا ۔ وہ ثریا انٹی کا بڑا بیٹا بوبی ۔۔ تیسرا سال تو ختم بھی ہو چکا اور اب تک
پانی کو پا کہتا ہے اور ہمارا چیکو ۔ اف خداوندا ۔۔ مارے مسرت کے وہ اکدم بڑے
بڑے پروگرام بنانے پر تل گئی ۔۔

" دیکھئے جی ۔۔ یہ ہمارا چیکو بے حد ذہین ہے ۔ ہم اسے کونونٹ میں تو
داخل کریں گے ہی ۔ مگر اس کا رجحان دیکھ کر تعلیم دلوائیں گے ۔۔ وہ جیسا روس اور
آسٹریلیا میں ہوتا ہے نا کہ بچوں کو ......

حامد میاں بور ہو کر بولے ۔۔" ہاں ہاں سب کر لینا مگر ابھی سے اتنے لمبے چوڑے
پروگرام بنانے کی کیا ضرورت ہے بھلا ۔ اِٹ وِل ٹیک اے لونگ ٹائم "۔

سوغات

علیہ ذرا برا مان کر بولی ــ "کیسے ڈیڈی ہیں آپ ــ کوئی اور ہوتا تو جانے کیا کچھ نہ کر ڈالتا ــ ننھی سی تو جان ہے اور ابھی سے اس مزے سے ڈیڈی ممی کہنے لگا ہے ہائے میں تو کسی سے بتاتی بھی نہیں کہ ابھی سال بھی پورا نہیں ہوا۔"

"عورتیں اپنے بچوں کے متعلق کس قدر باتیں کرتی ہیں ــ !! اب تو لگتا ہے کہ تمہارے پاس کے سارے ٹاپک ختم ہو گئے ہیں۔"

علیہ نے ذرا غور سے میاں کو دیکھا ــ "لے واہ ــ ایسی بھی کیا باتیں کرتی ہوں ــ بس یہی تو کہ ابھی اپنا بے بی سال بھر...... یکدم وہ کچھ یاد کر کے بولی ــ" ہاں ڈارلنگ ــ چھ دن بعد چیکو کا پہلا برتھ ڈے ہے، بہت زوردار قسم کی پارٹی کا انتظام کریئے ناــ آن کے ــ ؟

حامد میاں نے غور سے علیہ کی صورت دیکھی اور بولے ــ " اور شاید تمہیں یہ یاد نہیں رہا کہ دو دن پہلے ہماری میرج کی سالگرہ کا ڈے پاس ہو چکا ہے۔ ہماری میریڈ لائف میں یہ شاید پہلا موقع تھا کہ کوئی "اینی ورسری" مس ہوئی ــ مجھے یاد تھی جان کر انجان بنا رہا ــ تمہیں اپنے چیکو سے تو فرصت ملے ــ" !

• • • • •

برتھ ڈے پارٹی پر چیکو میاں کے ٹھاٹ نرالے تھے، مخمل کی نیکر، مخمل کی کوٹی، مخمل کے جوتے ــ بڑے بڑے ستھرے بھورے بال آنٹے جمے ہوئے ــ یوں رنگ کون کم گورا تھا کہ ماں نے پوڈر سرخی سے اور میدہ شہاب کر دیا تھا ــ کوٹھی سج رہی تھی۔ پوں پوں پیاپیں کرتی موٹریں آتیں اور کوٹھی کے ساتھ والے پارک میں ٹھہرتی جاتیں۔ مہمانوں کو ریسیو کرتے کرتے حامد میاں بور ہو گئے، سر میں درد ہونے لگ گیا۔ مگر علیہ کے گالوں کے گلاب یونہی مہک رہے تھے ــ ہنس ہنس کر ایک ایک کو آنارتی ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھاتی ــ چیکو کو پیار کرتی جاتی ــ

تحفے سنبھالنے کا وقت آیا تو چیکو میاں پورے بیٹے بن گئے ــ جو بھی مہمان کوئی تحفہ دیتا بڑی شرافت سے لے لیتے اور سر جھکا کر ادا سے سلام کرتے ــ علیہ نے خوش ہو کر فخر سے سب کی طرف دیکھا ــ

"کمال ہے مسزِ حامد — اتنا سا بچہ — بلیومی — اگر آپ یہ نہ کہتیں کہ آج پہلا برتھ ڈے ہے تو میں تو سمجھتی کہ تین سال کے ضرور ہیں یہ مسٹر۔"

"ریلی — میں خود سمجھ رہا تھا کہ دو ڈھائی سے کم کے کیا ہوں گے مسٹر چیکو۔"

مسٹر چیکو اپنی تعریف و توصیف سے بے نیاز، تحفہ اٹھاتے اور سیدھے ماں کے ہاتھوں میں تھما آتے — خوشی کے مارے عطیہ کے دانت منہ میں نہ سماتے تھے — ہنس ہنس کر کہتی — "سن رہے ہیں نا آپ۔"

"اجی دیکھ رہے ہیں نا آپ۔"

مہمان چلے گئے تو عطیہ میاں سے بولی — "لاکھ آپ مجھے جاہل کہہ لیں مگر میں تو اپنے چیکو کی کالے کوئلے سے نظر اتاروں گی — ہائے اتنے سارے لوگوں نے جانے کیسی کیسی میلی نظروں سے دیکھا ہوگا۔"

حامد میاں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اپنی ہی بات سنائی۔

"اف سر میں کس قدر درد ہو رہا ہے — سیویر ہیڈ ایک۔" ٹائی کھول کر انہوں نے یوں ہی میز پر پھینک دی اور کوٹ پتلون سمیت بیڈ پر بیٹھ گئے۔

عطیہ خوشی خوشی باورچی خانے گئی۔ وہاں سے کوئلہ لاکر اسے زمین پر گھسا اور تلوے اور ہتھیلیوں میں کالے داغ لگا دیئے — پھر چیکو کے سر پر سے ہرے ہرے پانی وار کے اس نے منہ ہی منہ بڑبڑانا شروع کر دیا۔

آٹے کی، گٹے کی

مالی کی، مہتر کی

بھنگی کی، تمبولی کی

بھنگن کی، تمبولن کی

سب کی نظر جو لگے ہیں جائے جل — جائے جل — جائے جل

وارے ہوئے پان اس نے مہری کو دیئے اور بولی —

"جا چولہے میں جلا دے پان۔"

حامد میاں نے بڑی کوفت سے اس کی طرف دیکھا۔" حد ہے! کوئی دیکھے گا تو

کیا کہے گا۔ بی۔اے پاس تو کیا، اس وقت چوتھی پاس بھی نہیں معلوم ہو رہی ہو تم۔ یہ سب کیا نان سنس ہے ؟"

"جی ہاں نظر بڑی بُری ہوتی ہے آپ کیا جانیں ۔۔۔ ؟ کوئی دکھ درد بھی ہو تو چلا جاتا ہے ۔۔۔!"

اکدم حامد میاں کو اپنے سر کے درد کا احساس ہوا۔ جھلا کر بولے

" تو پھر میری بھی نظر اتار دو ۔۔ میں بھی درد سے مرا جا رہا ہوں "۔

علیہ ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔

"ہائے کوئی سنے تو کیا کہے ۔۔ ؟

چیکو کو تھپکی دیتی ہوئی بولی ۔۔ "ذرا چیکو سو جائے ۔۔ پھر لائٹ آف کر دونگی"

وہ دھیرے دھیرے گانے لگی ۔۔

آجا نیند کی پری

آجا نیند کی پری .....

• • • • •

پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ بیرسٹر صاحب کی کار کے ہارن کی پیں پیں سنتے ہی علیہ دوڑی دوڑی آتی ۔۔۔ پورٹیکو میں جا کر خود ہی کار کا دروازہ کھولتی ۔۔ سرخ کوٹھی کے لمبے چوڑے پورچ سے ہوتے ہوئے دونوں میاں بی بی اپنے کمرے میں آجاتے ۔۔ علیہ کوٹ اتارتی ۔۔ نکٹائی کھولتی ۔۔۔ اور تو اور جوتوں کے بند بھی خود ہی کھولتی ۔۔ باہر کی دو چار باتیں پوچھتی اور پھر چائے لگوانے کے لئے دوڑ جاتی ۔۔۔

اب یہ ہوتا تھا کہ بیرسٹر صاحب کی کار کے ہارن کی پیں پیں سن کر علیہ دوڑ کر نہ آتی ۔۔۔ ہارن بجا بجا کر بیرسٹر صاحب بور ہو جاتے اور خود ہی کار کا دروازہ کھول یوں ہی اتر پڑتے ۔۔۔ سرخ کوٹھی کے لمبے چوڑے پورچ (جو اُن دونوں کو صدا ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آتا جاتا دیکھنے کا عادی تھا) سے وہ یونہی پیر پٹختے اندر کو آجاتے ۔۔۔ اندر آنے تو دیکھتے کہ گورنس تو ایک طرف اُلّو کی دُم بنی دم بخود کھڑی ہے ، اور علیہ بی بی چیکو کو سنبھال رہی ہیں ۔ ہنسا رہی ہیں، گدگدا رہی ہیں، کپڑے بدلوا رہی ہیں ۔۔ کنگھی کر رہی ہیں ۔ علیہ ایک

نگاہِ غلط انداز سے دیکھتی اور پھر مسرت سے کھل کر بولتی ــــ

" اجی سنتے ہیں آج جیکو نے کیا کیا ــــ ٹامی پھاٹک پر بیٹھا تھا، جاکر اُس کی دم گھسیٹ لی "ــــ

" قسم ہے آج تو میں حیران رہ گئی ــــ گورنس نے اوولٹین پلانا چاہا تو منہ پھیر پھیر لیا اور میں نے چمچہ دکھایا تو اکدم سے لپکا چلا آیا ــــ خدا وندا ــــ مجھے کس قدر پہچاننے لگا ہے "!

" ہاں ہاں تمہارا بیٹا تو بہت اڈوینچرس ہے " ــــ وہ جھلا کر کچھ نہ کچھ بول ہی دیتے۔

ایک دن حامد میاں برانڈے میں بیٹھے ہوئے تھے ۔ جیکو سارے کمرے میں شور مچا رہا تھا، کبھی تو لکڑی کے گھوڑے پر بیٹھ کر اچکنے لگتا، کبھی اپنی چھوٹی موٹر پر بیٹھ کر کمرے کے اندر ہی ڈرائیونگ کی مشق شروع کر دیتا ــــ علیہ بے حال تھی ــــ ہر ہر حرکت پہ نظر اور میاں کی توجہ دلانے پر آمادہ ــــ

" ہائے ذرا دیکھئے تو بیچ میں وہ سلولائیڈ کا بدوا پڑا ہے مگر اپنی موٹر کیا صاف نکال لے گیا ــــ ذرا تو دھکا نہ دیا "ــــ

" آپ نے مارک کیا زور سے چلاتے چلاتے کس مہارت سے اس نے بریک لگایا ــــ بالکل جیسا ہم آپ کرتے ہیں نا "ــــ

" ہاں ہاں وہ بڑا ہو کر بس موٹر ڈرائیور ہی بنے گا ــــ اور کیا "ــــ

" توبہ ــــ ایسی ہلکی بات کیسے سوچی آپ نے ــــ کیا ہم اپنے بیٹے کو بس ٹرک ڈرائیور بنا کر چھوڑیں گے "ــــ

میاں نے طعنہ مارا ــــ " اب یہ تو اپنے اپنے رجحان کی بات ہے بھئی ــــ تمہارا بیٹا موٹر کی طرف بہت اٹنشن پے کرتا ہے، ممکن ہے یہی اس کا پروفیشن بن جائے "!

" جی ایسا بھی کیا سوچتے ہیں آپ ــــ یہ کھیل کود کی بات تو ایسی ہے بھئی کہ ساری دنیا کے بچے ایک سے ہوتے ہیں "ــــ

عطیہ نے بڑی مشکلوں سے بے بی کو " کِس " کرنا سکھایا ــــ جس دن حامد میاں کمرے سے باہر نکلے تو جیکو میاں پھدکتے ہوئے گئے اور ٹانگوں سے لپٹ گئے ــــ باپ نے لاڈ میں آکر اٹھایا تو جھٹ سے جوابی کارروائی کر دی ــــ

" اچھا ۔۔۔ ؟ حامد میاں پھر سے بولے ۔۔۔ " یہ ٹھاٹھ " !!

علیہ ہنستی ہوئی آئی اور بولی ۔۔۔

" سچ کہئے آپ نے کسی اتنے چھوٹے بچے کو اتنا چالاک پایا "۔

" چالاکی کی کیا بات ہے ۔ اس نے کہیں نہ کہیں دیکھا ہوگا کہ ڈیڈی ممی کو کِس کر رہے ہیں ۔۔۔ بچہ بھی سیکھ گیا "۔

علیہ شرما گئی ۔۔۔ پھر ذرا برا مان کر بولی ۔۔۔

" حد ہے ۔۔۔ کبھی تعریف نہیں کرتے ۔۔۔ اور بے بی جب تک پیدا نہیں ہوا تھا کتنی باتیں کیا کرتے تھے ۔۔۔ اب تو یوں لگتا ہے کہ گھر میں آپ کو .....

چیکو ۔۔۔ چیکو ۔۔۔ چیکو ۔۔۔ جب دیکھو تب چیکو ۔ جب سنو تب چیکو کی باتیں ۔ جب آؤ تب چیکو کا ذکر ۔

حامد میاں نے بھونڈے پن سے ایک بالکل ہی غیر متعلق سوال کیا ۔۔۔

" ہاں ڈارلنگ ۔۔۔ یہ عورتوں کو اپنے بچوں سے زیادہ محبت ہوتی ہے یا میاؤں سے "۔۔۔ ؟

علیہ نے ایک دم چونک کر میاں کو دیکھا ۔۔۔

" جی ۔۔۔ جی ۔ کیا کہا آپ نے "۔۔۔ ؟

" یہی کہ ایک عورت اپنے بچے کو زیادہ چاہتی ہے یا اپنے شوہر کو ۔۔۔ آئی مین ۔ وہ ایک چائلڈ اور ہسبنڈ میں کس کو بڑی فکر کرتی ہے "۔۔۔ ؟

" اجی واہ ۔۔۔ یہ بھی خوب سوال کیا آپ نے ۔۔۔ کس کو کرتی ہے ۔۔۔ دونو ہی برابر ہوتے ہیں ۔۔۔ شوہر اس کے سہاگ کی مسرت ۔۔۔ بچہ اس کی ممتا کی تسکین ۔ ایک سی بات ہے کوئی فرق نہیں "۔ اس نے باری باری پیار سے چیکو اور حامد میاں کو دیکھا ۔۔۔

" حامد میاں نے صفا طعنہ مارا ۔۔۔ " بھئی ہم جو ایک دو مین بن کر پیدا ہوئے ہوتے تو ہسبینڈ سے زیادہ چائلڈ کو چاہتے "۔

علیہ نے انہیں دیکھا تو بولے ۔۔۔ " ہاں بھئی سچ کہہ رہے ہیں ۔ اور کیا ۔ عورت اپنے بچے کو ہی زیادہ تو دیتی ہے "۔ !

عطیہ کے ہاتھ سے چیکو کی گیند چھوٹی اور دُور تک لڑھکتی چلی گئی۔

دوسرے دن موسم بڑا خوشگوار ہوگیا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوائیں چل رہی تھیں۔ سورج غروب ہونے کو ہی تھا۔ عطیہ نے خود بھی ڈریسنگ کی اور چیکو کو پکڑ کر کپڑے بدلانے لگی۔ سنارک اسکن کے چھوٹے سے سوٹ میں مسٹر چیکو بے حد اسمارٹ نظر آرہے تھے۔ اس نے پیار سے دیکھا اور بولی۔ "کیا ٹھاٹھ ہیں پیارے"۔

گود میں اٹھائے اٹھائے باہر آئی اور بولی۔

"ڈیر آج ذرا گھومنے چلیں گے نا۔ دیکھئے آپ اور چیکو پیچھے بیٹھیں اور اسٹیرنگ میں سنبھال لوں"۔

حامد میاں بدک کر بولے "یوں کرو کہ چیکو کو پیچھے بٹھادو اور تم مزے میں ڈرائیونگ کرتی چلی جاؤ۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ اس وقت میں ذرا ہیڈیک محسوس کر رہا ہوں"۔

عطیہ ناگواری سے بولی "جانے آپ کو کون سا ہیڈیک لپٹ گیا ہے، ہر وقت اسی کا بہانہ کرتے رہتے ہیں۔

"بلیز۔ اکسکیوزمی۔ میں اس وقت موڈ میں نہیں ہوں"!

"دیکھئے موسم اتنا خوشگوار ہے کہ آپ باہر نکلتے ہی موڈ میں آجائیں گے۔ ذرا اٹھئے تو سہی"۔ وہ ذرا برا مان کر بولی۔ "جانے کیا ہوتا جارہا ہے آپ کو۔ پہلے تو کوئی بات نہیں ٹالتے تھے۔ اب یوں کٹے کٹے رہنے لگے ہیں۔ اٹھئے نا"؟

حامد میاں نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ یہ عطیہ اتنی بھولی کیوں ہے۔!

"بھئی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ چیکو صاحب کے ہوتے ہوئے آپ کو میری کمپنی کی ضرورت کیسے محسوس ہوسکتی ہے۔ میں نہ جاؤں گا"۔ وہ منہ موڑ کر بیٹھ گئے۔

عطیہ نے اب کے نہایت غور سے میاں کو دیکھا۔ اور پھر چیکو کو۔

"چیکو صاحب۔!! یہ بے چارے چیکو پر غصہ کیوں"؟؟ وہ ساڑی کا پلو سنبھالتی اندر چلی گئی۔

• • • • •

سوغات

گورنس اپنے بھدے بھدے جسم کو سنبھالتی ہوئی آئی اور دروازے کے پاس لگی لگی بے بسی سے بولی ۔

" بیرسٹر صاب — ہم بول نہیں سکتا یہ چھوٹا صاحب کس قدر ناٹی ہے ۔ آپ بلیو نہیں کرے گا صاب ۔ ہم سویا ہوا تھا ، کہ ہماری ناک پر کاٹ بھاگا ۔"

حامد میاں کو ہنسی آ گئی مگر روک کر بولے ۔

" تم نے اسے پنش کیا ہوتا ۔ ایسے تو وہ اور ناٹی ہوتا جائے گا ۔"

" نہیں صاب ہم صاب لوگ کو کیسے پنش کر سکتا ہے ۔ بڑا میم صاب ہم کو باتیں سنائے گا ۔"

" کون بڑا میم صاحب ۔" حامد میاں حیرت سے بولے ۔

" آپ کا ممی سر — " اس کی آواز میں بیزارگی تھی — " کوئی ہمیں کچھ نہیں کرنے دیتا ۔ اور بے بی حد درجہ ناٹی ہوتا جا رہا ہے ۔"

حامد میاں کچھ نہ بولے تو وہ پھر بولی ۔" اور سر ہم کنگھی کرتا ہے تو ہمارے بال نوچ ڈالتا ہے ۔ گیسٹ آئیں تو ہر ایک کو زبان نکال نکال کر چڑاتا ہے ۔"

" یہ جیکو اس قدر ناٹی ہے ۔" حامد میاں کو سوچ کر ہنسی آ گئی ۔ بولے ۔

" اچھا تم جاؤ ۔ ہم ممی سے سمجھا دیں گے کہ آپ گورنس کو کسی بات پر منع نہ کیا کریں ۔"

ادھر دادا دادی کیا پوتے کو دیکھنے آئے کہ جیکو میاں کو کھلی چھٹی مل گئی ۔ کسی کو دھول جما دی ، کسی کو کاٹ لیا ۔ کسی کے جسم پر پانی کا گلاس اوندھا دیا تو کسی پر کتے کو بھونکنے پر لگوا دیا ۔ حامد میاں حد درجہ پریشان تھے ۔ یہ سارے کرتوت علیہ کے تھے ۔ لاڈ میں سر چڑھا کر دو کوڑی کا کئے دے رہی تھی ۔ شام ہوئی تو ساس سسرے بہو اور پوتے میاں ، سب لان میں کرسیاں ڈلوا کر بیٹھتے ۔ نوکر دور کھڑے تماشہ دیکھا کرتے ۔ کبھی پھولوں کی شامت آتی ۔ کبھی پالتو چڑیوں کی ۔ کبھی بلی کی دم کھینچی جا رہی ہے تو کبھی دادی کی ناک ، علیہ کا ہنستے ہنستے برا حال ہو جاتا ۔ دادا دادی بھی پھولوں نہ سماتے ۔ حامد میاں اپنے کام کا بہانہ کئے اپنے کمرے میں ہی چھپے رہتے ۔

اس دن شام کو علیہ بکی ہوئی آئی اور بولی ۔

" ہائے جلدی ڈاکٹر کے پاس چلئے ۔ جیکو گلاب کا پھول توڑ رہا تھا کہ انگلی

بیں کانٹا چبھ گیا "۔

گلاب کے کانٹے پر اتنی پریشانی ۔۔!! حامد میاں کا غصہ بھڑک اٹھا مگر بھلے سبھاؤ میں بولے ۔

"کیوں ڈرائیور کہاں ہے "۔۔؟

"وہ آج چھٹی لے کر گیا ہے ۔ اٹھئے نا جلدی ۔۔ پلیز"۔

"تو تم خود چلی جاؤ "۔

"میں "۔۔؟ وہ چلا کر بولی ۔۔ "ہائے گھبراہٹ میں مجھے ڈرائیو کرنا بھی نہ سوجھے گا ۔۔ چلئے نا ۔ پلیز ۔ پلیز "۔

حامد میاں بدک اٹھے ۔۔ جھنجھ کر بولے ۔۔" اور جو میرے دل میں اتنے سارے کانٹے چبھے ہیں تو کبھی تم نے ...." جانے کیا سوچ کر وہ چپ ہو گئے اور درسان سے بولے ۔۔ "چلو "۔

راستہ بھر دونوں نے ایک بات نہ کی ۔۔ ایک بار عطیہ نے یونہی سر اٹھا کر دیکھا ۔۔ ان کے بال الجھے ہوئے تھے ۔ قمیض کے اوپری دو بٹن کھلے ہوئے تھے ۔ وہ بڑے بے تکے پن سے کار چلا رہے تھے ۔

عطیہ نے غور سے بہت غور سے حامد میاں کو دیکھا ۔ پھر دیکھا ۔ پھر دیکھا ۔ ایک بار اور دیکھا اور پھر روتے ہوئے چیکو کو زور سے لپٹا لیا ۔۔

• • • • •

دوسرے دن حامد میاں باہر جانے کو اٹھے تو عطیہ نے الماری سے کپڑے نکالے ۔ سوٹ کیس سے نیا سویٹر ۔ ہینگر پر سے ٹائی کھینچی اور کوٹ لے کر حامد میاں کے پاس پہنچی تو وہ بولے ۔

"آہاہ ۔۔ یہ آج کیا بھول ہو رہی ہے ۔۔ بائی گاڈ ۔ تمہیں بالکل زیبا نہیں کہ اتنے بڑے آدمی کو بچے کی طرح کپڑے پہناؤ "۔ وہ لفظ بچے پر زور دے کر بولے ۔۔

عطیہ نے کچھ جواب نہ دیا ۔۔ اور ہلکے سے مسکرا کر ان کی گردن میں ٹائی کسنے لگی ۔۔ ٹائی باندھ کر فارغ ہوئی تو برش لے کر جوتوں پر پالش کرنے بیٹھ گئی ۔

پالش کر چکی تو میز پر ناشتہ لگوایا ۔ میاں ناشتہ کر چکے تو ساتھ ساتھ موٹر تک آئی (آج کئی زمانے بعد لال تبعر کے پورچ نے پھر ان دونوں کو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آتا دیکھا) اور جب وہ موٹر میں بیٹھ گئے تو اپنا ہاتھ ہلا کر بولی ۔

بائی ۔ بائی ۔

حامد میاں باہر سے واپس ہوئے تو موٹر کی پیں پیں سنتے ہی عطیہ لپکی آئی ۔ کلر کا دروازہ کھول کر میاں کو اتارا اور دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اندر پہنچ گئے ۔ ٹائی، جوتے کوٹ سے فارغ ہو کر عطیہ چائے لگوانے اندر چلی گئی ۔ میاں چائے سے فارغ ہو گئے تو جا کر کپڑے بدل آئی اور ذرا لگاوٹ سے بولی ۔

" اتنے دنوں سے کوئی پکچر نہیں دیکھی ۔ آج چلیں گے " ؟؟

حامد میاں نے عطیہ کو دیکھا ۔ شلوار ۔ تنگ تنگ لمبی سی قمیض ۔ باریک نائلون کا انگا ۔ جسم کے سارے چھپے ڈھکے راز عریاں ہو رہے تھے ۔ وائف اتنی اسمارٹ نظر آ رہی ہو تو گھومنے کو نہ جانا سراسر بدذوقی ہے ۔ وہ مسکرائے ۔

" اچھا چلو ۔ تم کہتی ہو تو "

عطیہ نے مشینی انداز میں ہنستے ہوئے پرس اٹھایا اور بولی ۔ " چلئے " ۔

پکچر دیکھ کر لوٹے تو حامد میاں بھولوں نہیں سما رہے تھے ۔ عطیہ بی بی کے ہونٹوں کی لپ اسٹک ان کے اپنے ہونٹوں پر منتقل ہو گئی تھی ۔ اتنے دنوں بعد آج پکچر دیکھنے کا مزہ آیا ۔

" شام بڑی اچھی کٹی ۔ بائی گاڈ ۔ بڑی گرینڈ پکچر تھی " ۔ انہوں نے شرمیلی نگاہوں سے عطی ڈارلنگ کو دیکھا ۔

عطیہ نے خاموشی سے سر جھکا لیا ۔

ایک دن ۔

دو دن ۔

تین دن ۔

چار دن ۔ ......

ایک دن عطیہ حامد میاں کے پاس بیٹھی سوئیٹر بن رہی تھی کہ گورنس لپکی ہوئی

آئی اور بولی ۔

" میم صاب آپ بے بی کو اکدم بھول گیا ہے ۔ ایسے تو اس کی ہیلتھ پر برا اثر پڑے گا۔ کل سے تو وہ آپ کو بھوت یاد کر رہا ہے ۔ کہیں بیمار پڑ گیا تو "۔ ؟

حامد میاں اور علیہ نے ایک دوسرے کو چونک کر دیکھا ۔ پھر علیہ غصے غصے بولنے لگی ۔

" پھر تمہیں سَو روپے کاہے کے ملتے ہیں کہ ایک بچے کو سنبھال نہیں سکتیں ۔ ایسے کیسے بیمار پڑے گا "۔ ؟

" وہ ۔ وہ ۔ میم صاب ... " گورنس نے آج تک کبھی میم صاب کو اتنے غصے میں نہ دیکھا تھا ۔ سہم کر بولی ۔ " آپ پہلے تو اتنا لاڈ کرتا تھا اور اب اکدم بھول گیا ہے تو ......

" بکواس مت کرو ۔ جا کر بے بی کو دیکھو "۔

حامد میاں کی سمجھ میں یہ تماشہ بالکل نہ آیا اور انہیں پسند بھی نہ آیا ۔ چار پانچ دن اور یوں ہی گذر گئے ۔

ایک دن علیہ حامد میاں کی پسند کی شکم پور بنا رہی تھی ۔ باورچی خانہ کوٹھی سے خاصہ دور تھا ۔ علیہ کے پیچھے وہ بے بی کے کمرے پر گئے اور مہری سے پوچھا ۔

" کیوں بے بی کیسا ہے "۔ ؟

" اچھے ہیں سرکار ۔ پن اب شرارت پہلے جیسی نہیں کرتے ۔ جرا گریب ہو گئے ہیں پہلے سے "۔

" اور سرکار کیا کرتی رہتی ہیں دن بھر "۔ انہوں نے ذرا چپکے سے پوچھا ۔

" سرکار وہ تو آپ کے کمرے میں ہی رہتی ہیں ۔ کبھی سوئٹر بنتی ہیں ۔ کبھی آپ کے کپڑے جما جما کر رکھتی ہیں ۔ کبھی جوتوں پر پالش کرتی ہیں تو کبھی ......

" تو دن بھر یہی کام کرتی ہیں "۔ ؟

" ہاں ہاں بس ایسے ہی دن گجر جاتا ہے "۔

" اور بے بی کے پاس نہیں جاتیں "۔ ؟

پہلے تو سارا سارا دن بے بی سے ہنسنے بولنے گجر جاتا تھا ۔ پن اب تو کبھی

پلٹ کر دیکھنا بھی نہیں ۔۔۔ اگر گورنس کچھ شکایت کرے تو بگڑ کر بولتی ہیں ۔۔۔ "سو روپے کا ہے کے لینی ہے ۔۔۔؟"

"اور بے بی بھی یاد نہیں کرتا ۔۔۔؟"

"اے سرکار وہ تو آٹھ چار دن میں ہی سوکھ کر رہ گئے ہیں۔ آپ کو اپنے کام کاج سے کہاں پھرصت کہ بابا سرکار کی کھبر لیں" ۔۔۔ مہری ایسی بدتمیز تھی کہ جو منہ میں آتا مزے سے بک جاتی ۔۔۔

ابھی ابھی آٹھ چار دن پہلے جس گھر میں قہقہے اچھلتے تھے، اکدم سے سناٹا پڑ گیا۔ چیکو میاں ماں کی شہ پاکر شیر بنے تھے ۔۔۔ اب ماں نے رخ پھیر لیا تو ان کی ہستی بھی ہوا ہو گئی۔ پہلے تو بار بار کمرے کے دروازے کے پاس آ آ کر جھانکتے ۔۔۔ بڑی دل لبھانے والی آواز میں پکارے جاتے ۔۔۔ مم ۔ می ۔ مام ۔ سری ۔۔۔

مگر ممی بجائے لینے یا چمکارنے کے بولتیں ۔ "جاؤ آیا کے پاس جاؤ" ۔۔۔ وہ بھلا کب کوئی بات مانتے تھے کہ ابھی مان جاتے ۔۔۔؟ اندر ہی گھسے آتے تو وہ جھڑک کر گورنرنس سے بولتیں ۔۔۔

"اسے لے جاؤ گی یا نہیں ۔۔۔؟"

وہ بھد بھد کرتی آتی اور اینٹھتے ہوئے اٹھا لے جاتی ۔۔۔

یسوع مسیح کی دہائیاں دیتی ہوئی بولتی ۔۔۔

"خداوندا ۔۔۔ کیسا ناٹی بوائے ہے ۔ ہم نے اپنی لائف میں ایسا بے بی کبھی نہیں پالا ۔۔۔"

پندرھواڑے کے پندرھواڑے بے بی کا وزن ہوتا تھا ۔۔۔ اب کے جو ہیلتھ رپورٹ آئی تو چیکو میاں کا دو پونڈ وزن کم ہو گیا تھا ۔۔۔

عطیہ تو سن رہ گئی مگر حامد میاں کو پتہ نہ چلا ۔۔۔ پتہ چلتا بھی نا اگر مہری اور گورنس آپس میں باتیں نہ کرتیں ۔۔۔

"ممی اگر اٹنشن پے کرنا چھوڑ دے تو بچے کی ہیلتھ بہت ڈاؤن ہو جاتی ہے۔"

مہری کچھ نہ سمجھ کر حیرت سے بولی ۔۔۔ "وہ کیا بات ہوئی ۔۔۔؟"

گورنیس جھلّا کر بولی ۔" تم لوگ جلدی بات سمجھتا کیوں نہیں ۔ ماں محبّت کرنا چھوڑ دے تو بچّہ کا تندرستی کھراب ہو جاتا ہے ۔ دیکھو اتنی جلد دو پونڈ وزن اتر گیا"۔
"دو پونڈ بولے تو کتنا"؟
"تمہارے حساب سے ایک سیر"۔
"بیارے ۔ مہری سینے پر ہاتھ رکھ بولی ۔ ایک سیر ۔ ؟؟
حامد میاں نے جا کر چیکو کو دیکھا ۔ اپنے بستر پر وہ کھلونوں میں گھرا پڑا تھا مگر ان سے کھیل نہیں رہا تھا ۔ گال پتلے پتلے ہو گئے تھے اور رنگ جو گلاب کی مانند تھا ذرا پھیکا پھیکا سا پڑ گیا تھا ۔ وہ پریشانی سے عطیہ کے پاس آئے ۔
" ارے عطی ڈیر ۔ یہ چیکو کی ہیلتھ ڈاؤن کیوں ہوتی جا رہی ہے"؟
" ویسا ہی تو ہے"۔
" کہاں ہے ۔ تم نے رپورٹ دیکھی ۔ اور اب شرارتیں بھی ختم کر دی ہیں ۔ دہاٹ ہیپنڈ ٹو ہم"؟
" ہی از پرفکٹ لی آل رائٹ"۔ عطیہ نے سر جھکائے جھکائے آزردگی سے جواب دیا ۔
ہوتے ہوتے چیکو کے قہقہے بالکل ہی ختم ہو گئے ۔ اگلی رپورٹ آئی تو اس میں خاصی پریشانی کا اظہار کیا گیا تھا ۔ چیکو کو مستقل ٹمپریچر رہنے لگا ۔ چیکو کا کمرہ الگ تھا ۔ گورنس ساتھ ہی رہتی تھی ۔ وہ بار بار ممی ممی کی رٹ لگاتا ۔ گورنس کبھی ممی سے جا کر کہتی کہ "بابا سرکار آپ کو پکارتا ہے" تو ممی بہر کر گھر کی بتاتی ۔
" تم سے اتنے سے بچّے کو بہلانا بھی نہیں ہوتا تو سروس کرنے نکلی ہی کیوں ہو"؟
ایک رات حامد میاں کی آنکھ کھلی تو ہلکی سبز روشنی میں انہیں عطی ڈیر کا پلنگ خالی نظر آیا ۔ تشویش سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر باہر نکل آئے ۔ باہر سیڑھیوں پر عطی بیٹھی جھم جھم روئے جاتی تھی ۔ انہوں نے سہم کر اسے دیکھا ۔ وہ اس قدر دبلی نظر آ رہی تھی ۔
عطیہ مشین بن کے رہ گئی تھی ۔ ہنستے ہوئے کوٹ چڑھانا ۔ مسکراتے ہوئے ٹائی

باندھنا۔ گنگناتے ہوئے جوتوں کو پالش کرنا اور لچکتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدموں سے میاں کو رسیو کرنے پورچ تک آنا۔ اب حامد میاں کو عطیہ سے کوئی شکایت نہ تھی مگر پھر بھی وہ بے کل بے کل سے نظر آتے ۔ گھر میں ان کا دل نہ لگتا ۔ کون تھا جس نے ان کی خوشیوں بھری زندگی میں ایسے کانٹے بو دئیے تھے ۔ ؟ عطیہ کے پیار کرنے انہیں کبھی چیکو کو پیار کرنے کی تمنّا نہ ہوئی ۔ بلکہ انہیں تو چیکو کو دیکھتے ہی آگ لگ جاتی تھی، مگر اب تو انہیں لگتا کہ چیکو نہیں تو کچھ بھی نہیں ۔ عطی ڈارلنگ کی اداؤں میں کوئی دل لبھا لینے والا انداز تھا نہ زندگی میں کوئی رس ۔ گھر کی خوشی کو کسی نے جیسے قید کر لیا تھا ۔

اُس رات چیکو کی طبیعت اچانک اتنی بگڑ گئی کہ گورنس چیخیں مارتی ہوئی عطیہ کے کمرے کو لپکی آئی ۔

" سَر ۔ میم صاحب ۔ بے بی چیختا ہے ۔ ممّی کو یاد کرتا ہے ۔ پاؤں پٹختا ہے اور زور زور سے ہنستا ہے "۔

عطیہ اکدم سے اٹھ کھڑی ہوئی مگر حامد میاں کی طرف دیکھ کر پھر رک سی گئی ۔ ایک پھندہ سا آکر حلق میں اٹکا اور اس نے منہ پھیر لیا ۔

بیرسٹر صاحب اچھلے اور اکدم بولے " اور تم نے ڈاکٹر کو فون بھی نہیں کیا " ؟

گورنس نے بھی دھوپ میں بال نہیں کھائے تھے ۔ ذرا غصّے سے بولی ۔

" آپ دونوں کے جھگڑے نے ہمارے بے بی کا سر گڑا کر دیا ۔ ایسے بیمار کو ڈاکٹر کی نہیں مدد کی کوئی ضرورت ہوتی ہے سَر "۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ۔

وہ بڑے پیار اور بزرگانہ انداز سے بول رہی تھی ۔

" ارے کبھی بچّے کی وجہ سے ایک وائف اپنے ہسبنڈ کو ہیٹ کرسکتی ہے ۔ چائلڈ تو دونوں میں پیار بڑھاتا ہے اور ......

حامد میاں نے پھر کچھ نہیں سنا ۔ جلدی سے عطیہ کا ہاتھ پکڑا اور بولے ۔

" ڈارلنگ اٹھو ۔ چیکو تمہیں پکار رہا ہے "۔

عطیہ کے آنسو بہہ رہے تھے ۔ وہ بے تابی سے چیکو کے کمرے کی طرف بھاگی ۔

اور حامد میاں بھی پیچھے ہی لپکے ۔۔

"مم ۔ می ۔ مام می ۔ جیکو کی ہچکی بندھ گئی تھی ۔ عطیہ نے بڑھ کر اسے گلے میں لپٹا کر بے تحاشا چومنا شروع کر دیا ۔ " میرا بچہ ۔ میر گڈا ۔ میرا جیکو ۔ میرا لال ۔ وہ بدحواس ہوئی جا رہی تھی ۔

جیکو نے آنکھ کھول کر ماں کو دیکھا اور پہچان کر اکدم پیار کرنا شروع کر دیا ۔ ممی کے گالوں پر ۔ گردن پر ۔ بالوں پر ، ننھے ننھے ہونٹ ۔ چٹ ۔ چٹ کرتے گئے ۔

عطی ڈارلنگ ۔ تمہارا بے بی تو بڑا جینیس ہے بھئی ۔ حامد میاں شرارت سے مسکرائے ۔ " ابھی سے کِس کرتا ہے ۔ آئیں " ؟؟

عطیہ نے آنسوؤں کی بوچھاڑ میں سے ہنستے ہنستے جھانکا اور لجتے شرماتے بولی ۔۔ "کس کا بیٹا ہے آخر ۔ ؟؟

" اچھا ۔ ؟ اور بیرسٹر صاحب نے آگے بڑھ کر عطی ڈارلنگ کے گال پر ایک بھرپور " کِس " ثبت کر دیا ۔۔

جیلانی بانو

"ایک آرٹسٹ"

کھانا پکانے والا باورچی بھی اپنے آپ کو فن کاروں میں شمار کرتا ہے! اس بات کا انکشاف اس دن ہوا جس دن الہ دین مجھ سے ملنے آیا تھا۔

اس نے وندرا اپنے نام کی جو چٹ بھجوائی اس پر لکھا ہوا تھا: "ایک آرٹسٹ"۔

اس دن وہ خوب بن سنور کر آیا تھا۔ ہاتھ سے دھلی ہوئی سفید مگر شکن آلود پینٹ سفید شرٹ اور سالم چپلیں۔ اس کے بال بھی ترقی پسند شاعر کٹ تھے۔ حلیہ دیکھتے ہی میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ اپنے ہی گروپ کا آدمی ہے — یعنی ترقی پسند۔

اپنے تعارف سے پہلے اس نے میری تعریف شروع کر دی —

"آپ کی چٹخارے دار کہانیاں پڑھ کر تو زبان کا مزہ سنور جاتا ہے جی — واللہ آج کل کی بدمزہ پھیکی سیٹھی کہانیاں پڑھنے کے بعد تو میرا ہاضمہ خراب ہوا جا رہا تھا۔"

جواب میں مجھے مسکرانا پڑا۔ یعنی میں کس قابل ہوں!

اس کے بعد وہ فن کی گٹھری کھول کر بیٹھ گیا۔

"فن کار کا کمال تو یہ ہے جی کہ وہ اپنی ذات کو فن میں گوشت کی طرح گلا ڈالے۔ اپنے خون کا آخری قطرہ بھی کیوڑے کی طرح فن کے اوپر چھڑک دے۔ ارے فن کار کو تو ہر وقت فن کی دیگ میں دم ہونے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔"

اگر کوئی اپنے آپ کو فن کار کہلوانے پر تلا ہو تو غالباً دستورِ ہند کی کوئی دفعہ اسے نہیں روک سکتی۔ اس لئے میں نے بھی خاموشی بہتر سمجھی۔

"آپ نے کوئی غزل لکھ لی ہے یا نظم لکھنے والے ہیں!"

"میں نے —! اس نے مجھے ایسی قہر آلود نظروں سے گھورا کہ میں سہم گئی دغا یا وہ

ایسا شاعر ہے، جس کا دیوان عنقریب چھپنے کی امید ہے)

"میں نے عمر بھر میں ایک شعر تک تیار نہیں کیا نرسی، میرا آرٹ دوسرا ہے زناب۔"

وہ اتنی بلندی پر پہنچ کر مسکرایا کہ مجھے اپنی ذات چیونٹی کی طرح حقیر نظر آئی۔

"میں تو بہت دنوں سے بیکار ہوں نرسی۔ اب تو کوئی فن کا قدرداں ہی نہیں رہا۔ بڑے دنوں سے کسی فن کار کی تلاش میں تھا۔ کلو للو نے بتایا کہ اس کی بی بی آپ کو بہت بڑا آرٹس مانتی ہیں۔ آپ کی تو بڑے بڑے نوابوں سے رشتے داری ہے۔"

"کون للو۔۔۔!" میں نے بڑے تحمل سے پوچھا۔

"اندی وہی ریڈیل والے انزنیئر کا خنساماں۔"

اب میں نے اسے بغور دیکھا۔ صرف اس لئے کہ وہ کتنی پیئے ہوئے ہے! مگر وہ نرا پیاسا تھا۔ اس کا سیاہ رنگ، خشک ہونٹ اور پیاسی آنکھیں، اس برتن کی طرح خشک اور بدنما تھیں، جو روزانہ چولھے پر رکھ کر جلایا جاتا ہو۔

دو تین منٹ تک اس نے میرے بولنے کا انتظار کیا۔

"تو میں اس لئے آپ کے پاس حاضر ہوا تھا نرسی کہ ایک آرٹس ہی دوسرے آرٹس کی قدر کر سکتا ہے اور۔۔۔"

"اپنی کوئی کہانی چھپوانا چاہتے ہیں آپ؟" میں نے اس کی بات کاٹی۔

"نرسی میں نے عرض کیا نا کہ میرا میدان دوسرا ہے۔ اس کے مسائل پر اور زمانے کی ناقدری پر یوں بحث کی کہ میں نے اس کے "آرٹ" کو سارے فنونِ لطیفہ کی جڑ مان لیا۔

"ایک بہت بڑے شاعر صاحب ہیں نرسی۔ اپنے آپ کو وہ بھی آرٹس سمجھتے ہیں مگر دوسرے آرٹس کی قدر نہیں کرتے۔ کہنے لگے کہ اگر باورچی بھی فن کار ہو سکتا ہے تو میں اپنی کل نظمیں تمہیں چولہا سلگانے کو دے دوں گا۔۔۔ دیکھا آپ نے! اب دنیا میں صرف زاہل باقی رہ گئے ہیں۔"

میں نے دیکھا۔ وہ دنیا کا اکلوتا آرٹس رومال سے اپنی آنکھیں پونچھ رہا تھا اور اس کا سیاہ چہرہ واقعی غصہ کے مارے تمتما گیا تھا۔ آنسو میری کمزوری ہیں بلکہ سچ پوچھئے تو میں نے کہانیاں صرف اسی لئے لکھنا شروع کیں کہ روتے ہوؤں کو تسلی دے سکوں لہٰذا اسے بھی شاعر نہ پکڑا سکی۔

سوغات

ان دنوں خانساماں ہمیں بہت ستا رہا تھا۔ لیکن گھر والوں پر اُس کا اتنا رعب تھا کہ نکالنا تو در کنار اُس سے شکایت کر کے بھی الٹی آنتیں گلے میں پڑ جاتی تھیں۔ جو ملازم دس بارہ سال سے گھر میں ہوں وہ رفتہ رفتہ مالکوں کے سارے حقوق سلب کر لیتے ہیں۔ لیکن الہ دین کو دیکھ کر مجھے اچانک خیال آیا کہ تھوڑے دنوں خانساماں کے سینے پر مونگ کی بجائے الہ دین کو دلنا چاہئے۔

مزید پوچھ گچھ پر معلوم ہوا کہ الہ دین بالکل جاہل نہ تھا۔ ایک شاعر نے اسے آتش جیجو باور سے، آتش غالب اور آتش سورداس کی خودداری کے وہ قصے سنائے، جب انہوں نے اپنے فن کے آگے جان کی پرواہ نہ کی تھی۔

اُس نے آٹھ جماعتیں پوری پاس کی تھیں اور نویں کلاس کی صرف انگریزی اردو اور حساب میں فیل تھا۔ لیکن الہ دین کو کامل یقین تھا کہ وہ درصل فیل نہیں ہوا تھا بلکہ یہ صرف ماسٹر صاحب کی بیمار مرغی کو ہسپتال نہ لے جانے کا نتیجہ تھا۔ اگر وہ ذرا سی کاہلی نہ کر جاتا تو کسی اسکول میں بچوں کا قیمہ بنا بنا کے ان کے انوکھے کبابوں کا تجربہ کرتا۔ یہ بات اس نے جس وقت سنائی ہے تو اس کے دل میں اور چہرے پر اپنے لئے ایک ماسٹر کا احترام تھا۔

"فن کار بننے کے لئے تو صرف ایمان کی سلامتی چاہئے نری" اس نے تاتینیں چڑھا لیں۔ "ایمان مضبوط ہو تو انسان پل صراط پار کر لیتا ہے۔"

مجھے بھی گردن ہلا کے اس کی تائید کرنی پڑی۔

الہ دین کے باورچی خانے میں گھستے ہی وہ گھمسان کا رن پڑا جو دو اجنبی مرغوں میں تعارف کے بعد ہونا چاہئے۔ خانساماں لڑتے لڑتے تھک گیا تو اپنا بوریا بستر سمیٹنے لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے سمجھایا کہ الہ دین ہمارے ہاں نوکری کرنے نہیں آیا۔ میں اسے کسی جگہ ملازمت دلوانے سے پہلے اس کا کام دیکھنا چاہتی ہوں۔ ادھر الہ دین کے فن کارانہ جذبات کو بھی زوردار ٹھیس لگی۔ دل برداشتہ ہو کر وہ سیڑھیوں پر جا بیٹھا۔

"پچھلے زمانے کے آتش ایک دوسرے کے لئے زلفیں لڑا دیتے تھے، زبھی تو آرٹ نے اتنی ترقی کی تھی۔ اب تو گھوڑے گدھے کو ایک ہی چابک سے ہانکا جاتا ہے۔"

"ہوش میں رہو فن کار میاں" خانساماں چولہے کے پاس سے للکارا۔ "مجھے گھوڑا

کہا تو کسی چڑیا گھر میں پہنچا دوں گا۔"

شکر ہے کہ اپنی ٹرٹر میں الہ دین نے یہ بات نہ سنی۔

پہلے دن اس نے مچھلی کا حلوہ بنانے کا ارادہ کیا۔

"مچھلی کا حلوہ —!" یوں لگا جیسے سالم مچھلی حلق میں اٹک گئی ہے۔

"آپ کھا کر تو دیکھئے۔ یہ روز عام اور واہیات حلوے کھا کھا کر آپ کا ذائقہ تباہ ہو گیا ہے۔ وہ سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔"

"اچھا —" میں راضی ہو گئی۔

صبح سے شام ہوئی لیکن خانساماں کی اطلاعات کے مطابق وہ مچھلی کو غسلِ میت ہی دئے جا رہا تھا۔ شام کو وہ اپنی دانست میں خوب سنگار پٹار کئے ہوئے آیا۔

"وہ مچھلی کا حلوہ تو ابھی تیار نہیں ہوا نری؟"

"خیرات کے کھانے تک تیار کر لو۔"

"مگر اب تو میں نوراً گھومنے جا رہا ہوں۔ شام کا وقت فن کاروں کے کام کا نہیں ہوتا۔ نہ جانے آپ کیسی فن کار ہیں کہ شام کے وقت پڑھتی ہیں۔"

"لاحول ولا۔ میں کیوں ہونے لگی فن کار۔" میں سچ مچ بچوں کی طرح چڑ گئی۔

"ہیں ہیں ہیں —" وہ بے حد برتری کے احساس کو لئے ہوئے ہنس پڑا۔ جیسے پرتھوی راج کسی مسخرے کو اپنی نقل اتارتے دیکھ کر خوش ہو رہا ہو۔

دوسرے دن وہ نو بجے تک پڑا سوتا رہا۔ اٹھا تو موسم کی سختی کا شکوہ کیا اور پڑوسیوں کی بے ہنگم چیخ پکار پر لعنت بھیجی۔ پھر ایک گھنٹے تک سگریٹ پیا۔ ناشتے کے بعد بارہ بجے چولہے کے پاس گیا اور دوسرے دن حلوہ تیار تھا۔

سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق اس کے سامنے تو ہم نے حلوے کی یوں تعریف کی جیسے پکاسو کے کسی شاہ کار کی تعریف کر رہے ہوں لیکن حلوا واقعی لاجواب تھا اور کوئی آرٹسٹ کا باپ اس میں مچھلی کی بو اور ذائقے کی شناخت نہیں کر سکتا تھا۔

بڑی کوشش اور جستجو کے بعد میں نے الہ دین کو ایک شاندار ہوٹل میں نوکری دلوا دی۔ ڈیڑھ سو روپے تنخواہ تھی۔ اس کا کام صرف باورچیوں کو ڈائرکشن دینا تھا۔

لیکن دوسرے دن الدین پھر میرا نام لے لے کر پکار رہا تھا۔

"ہم وہ نوکری چھوڑ آئے ہیں نری !" اس نے کچھ اس شان سے سنایا جیسے مجھے اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالنا چاہیں۔

کیوں ـــــ! میں سمجھ گئی۔ ہوٹل کے مینیجر نے اپنی دولت کے بھرے میں اس کے فن کارانہ جذبات کی قدر نہ کی ہوگی۔

"ہمیں پہلے ہی معلوم تھا کہ ہمارے قدر دان صرف نواب لوگ ہیں۔ ان کے علاوہ اب کوئی نہیں ہے وہ سالا منیجر (مینیجر) کہتا ہے کہ قورمے میں ہلدی ڈالو۔ وہ لوگ کیا جانیں کھانے کا آرٹ۔ ارے اس ہوٹل میں تو بھڑ بھنبھوں (بھڑ بھنجوں) کی صورت تو دو لینے آتے ہیں ذرد کھیر اور فیرنی میں تمیز نہیں کر سکتے۔"

غصہ کے مارے اس کے منہ سے کف نکل رہا تھا اور پورا بدن یوں کانپ رہا تھا جیسے خوب زور کی سردی پڑ رہی ہے۔

"پھر ـــــ !"

"پھر کیا ـــــ !" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں نے بھرے ہوٹل میں زور کہہ دیا کہ یہاں کھانے والے تو الٹی چھری سے آٹے کو حلال کرتے ہیں۔ اس لئے بندہ بندگی عرض کرتا ہے۔"

"ارے چھوڑو ذرا سی بات کو۔" میں نے اپنی جان چھڑانا چاہی۔

"ذرا سی بات ـــــ یہ ذرا سی بات ہے !" اس نے جیسے انگارہ چھو لیا ہو۔

"آپ تو صرف کہانیاں لکھتی ہیں نری۔ آپ کیا جانیں فن کیا ہوتا ہے۔ کسی آرٹس کے آرٹ میں آگ لگا دی جائے تو کیا اس کی روح نہ جلے گی ؟ ایک اکبر بادشاہ بھی تو تھا۔ کیا آنسوؤں کی قدر تھی اس کے نزدیک۔"

مجھے اس شاعر پر غصہ آ رہا تھا جس نے اسے آرٹس کا نام رٹا دیا تھا اور ان ماسٹروں پر غصہ آ رہا تھا جنہوں نے آٹھویں جماعت تک کا علم الدین کے دماغ میں برچھی کی طرح گھونپ کے چھوڑ دیا تھا۔ آٹھویں جماعت کا فیض ہی تو تھا کہ اس کے لئے زمین پر جگہ رہی تھی نہ آسمان پر۔

"فن کاروں کو موت تو اسی دن آ گئی تھی الدین جس دن اکبر بادشاہ مرا۔۔ تم دیکھ رہے ہو کہ آج کل ہی لئے فن کاروں نے پیشہ اپنا چھوڑ دیا ہے۔" میں نے اسے سمجھانا چاہا۔

"پیدا ہونا بھی کوئی اپنے اختیار کی بات ہے۔! وہ برا مان گیا۔

"آرٹسٹ تو اللہ میاں کی طرف سے بھیجا جاتا ہے کہ وہ ہوٹل کے بدذوقوں کو سبق سکھائے۔"

"یہ بھی اردو کی آٹھویں کتاب میں لکھا تھا!" میں نے گھبرا کے پوچھا۔

"نہیں نہیں، یہ میرا اپنا خیال ہے۔"

"اوہو — تم نے آرٹ کے متعلق بڑی ریسرچ کر ڈالی ہے تو پھر کہیں ہوٹل والوں میں جمالیاتی ذوق پیدا کرنے کے لئے وہ نوکری ضرور کرنا چاہئے۔"

"چھوڑیئے جی۔ ہم بھینس کے آگے بین نہیں بجائیں گے۔"

وہ اٹھا اور باہر چلا گیا۔ میں سمجھی منہ کے جھاگوں کو باہر تھوکنے گیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد پھر وہ اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ مگر اس نے غالباً میرے آگے بین "بجانا" بھی فضول سمجھا۔

کئی دن گزر گئے۔ اب دروازے پر کسی کی آہٹ سن کر اللہ دین کا جو خدشہ لگا رہتا تھا وہ ختم ہو گیا مگر خانساماں اکثر اپنی سوکن کی طرح اسے یاد کرتا تھا۔

"سالا کہتا تھا مجھے بگھیر کے فقیر بننا پسند نہیں۔ میں تو کھانے میں نئی نئی باتیں پیدا کرتا ہوں۔ پچیس طرح کا قورمہ پکوا لو۔ پچاس طرح کا پلاؤ پکوا سکتا ہوں۔" پھر وہ حلق پھاڑ کے قہقہہ لگاتا جس میں ہم سب کو شریک ہونا پڑتا تھا۔ خدا رزاق ہے مگر اس رزق کو منہ تک پہنچانے کے لئے خانساماں کے قہقہوں میں شرکت کرنا لازمی ہے۔

لیکن چند دن بعد اللہ دین پھر دروازے پر دھرنا دئیے بیٹھا تھا۔

آخر بڑی چھان پھٹک کے بعد میں نے اسے بڑے نواب صاحب کے سپرد کر دیا۔ وہ بے حد شاندار بلکہ کمیاب نوابوں میں سے ہیں۔ نوابی کی خیالی مسند پر بیٹھنے کے باوجود ہر کام شاندار انوکھا اور ٹھاٹ باٹ کا ہوتا ہے۔ اچھے کھانے اور اچھے باورچیوں کے بڑے قدرداں ہیں۔

میں نے اللہ دین کا تعارف اتنے پرشکوہ انداز میں کیا کہ وہ بھی مرعوب سے ہو گئے۔ ساتھ ہی اس کی نازک مزاجی کی اونچ نیچ سمجھا دی۔

نواب صاحب کے ہاں نوکری ملنے کی خوشخبری سن کر وہ بھی اچھل پڑا۔ خوشی کے مارے اپنے ہاتھ توڑ پھینکنے کی کوشش کی۔ قمیض میں لگا ہوا اکلوتا بٹن توڑ ڈالا اور مجھے مشتبہ

. . . . نظروں سے دیکھنے لگا۔

"آپ نے تو بہت بڑا کام کر ڈالا زی۔ مزے دار مجھے تو یقین نہیں آتا۔"

"کس بات کا یقین نہیں آتا! میں نے تفریحاً پوچھا۔

"یہی کہ آپ سچ مچ آرٹسٹ ہیں۔ مزے تو للّو کی بات زملی (جھوٹی) ہی لگتی تھی۔"

"خوب" میں نے سچ مچ زہر کا گھونٹ پیا۔

اب دیکھنا میرے فن کا کمال۔ لوگ ہکا بکا رہ جائیں گے۔ اب ایک قدرداں ملا ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ہم آرٹسٹوں کی کہیں قدر ہوسکتی ہے تو وہ صرف یہی نواب لوگ ہیں۔ کھانا کھانا بھی تو ایک بہت بڑا آرٹ ہے زی۔

لیکن مجھے اب اس کی صورت زہر لگ رہی تھی۔

تیسرے دن الہ دین کی بجائے نواب صاحب خود حواس باختہ سے آئے۔ خلاف معمول بغیر اطلاع دیئے بغیر ۔۔۔۔ نوکروں اور مصاحبوں کے۔

کس خطبی کو بھیج دیا تھا آپ نے ۔۔ ؟

جانے کیوں ان کی صورت دیکھ کر مجھے ہنسی آرہی تھی۔

"وہ بہت بڑا فنکار ہے جناب۔ آپ اس کی قدر کرنا سیکھئے۔

لیکن اس نے تو رات کنوئیں میں گر کے خودکشی کرلی"۔

کیا ——————— ؟

"بیٹھے بٹھائے کی مصیبت گلے پڑ گئی ہے۔ صبح سے پولیس اسٹیشن پر بیٹھا ہوں۔

"ہوا کیا ۔۔ ؟ میں بڑی مشکل سے پوچھ سکی۔

"ہوا کیا ۔ انہوں نے پائپ سلگایا۔" دن بھر بیٹھا پلاؤ میں جانے کیا جواہر ریزی کرتا رہا۔ سنہرے روپہلے ورق چاولوں پر لپیٹے۔ دستر خوان چنا گیا۔ تو یوں ٹہل رہا تھا جیسے برنارڈ شاہ اپنا نیا ڈرامہ اسٹیج پر پیش کر رہے ہوں۔ کہنے لگا۔ جناب میرے فن کی قدر اب آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ میں کھانے بیٹھا تو یوں ہی پلاؤ میں ذرا سا ہاتھ ہی چلایا۔ بس جناب! یوں لگتا تھا جیسے میں نے گھڑا بھر تیزاب اس کے اوپر اچھال دیا ہو۔ چیختا چلاتا باہر بھاگا۔ کہ ہائے اب کوئی قدرداں نہیں رہا۔ اب فن کار کو ڈوب مرنا چاہیئے۔

اور پھر اس نے کنوئیں میں چھلانگ لگادی۔

ضمیر الدین احمد

یہ سارے واقعات آپ کو اتفاقات کی ایک عجیب سی کڑی میں منسلک نظر آئیں گے۔ کیا آپ اتفاق نہیں کہیں گے کہ میں سات سمندر پار امریکہ کی ایک مشہور و معروف یونیورسٹی سے جو پاپوں کے گھروں میں ہونے والی بیماریوں پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر اسی دن الہ آباد پہنچا جس دن شہید ڈے منایا جا رہا تھا؟ کہاں امریکہ اور کہاں الہ آباد! ہزاروں میل کا فاصلہ۔ اور پھر اچانک واپسی۔ سات سال سے امریکہ میں تھا۔ کم از کم تین سال اور قیام کرنے کا ارادہ تھا۔ سوچا تھا کہ لگے ہاتھوں پرندوں کی طرزِ پرواز پر بھی ڈاکٹریٹ حاصل کرلوں۔ مگر اچانک اپنی حکومت کی طرف سے مجھے اتنا اچھا آفر ملا کہ دوسری ڈاکٹریٹ کا خیال ترک کرنا پڑا۔ اور امریکہ جیسے دلکش اور دلفریب ملک کو چھوڑ کر اپنے انتہائی غلیظ نادار اور پسماندہ ملک کا رخ کرنا پڑا! ڈھائی ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ۔ سرکاری مکان۔ سرکاری کار اور آسامی مستقل۔ میں نے تو اسی وقت فیصلہ کرلیا۔ جس وقت ہمارے سفارت خانے کے فرسٹ سکریٹری نے حکومت کا یہ آفر مجھے دیا۔ "ایکسٹرا ایڈیشنل ڈائرکٹر جنرل مسائل بے روزگاران" کتنا رعب دار عہدہ۔ اور کتنا رعب دار نام اس عہدے کا!

مگر یہ ضروری تو نہیں تھا کہ میں اس عہدے کو قبول کرنے اور دلکش امریکہ کو خیرباد کہنے کے بعد اسی دن الہ آباد پہنچتا۔ جس دن شہید ڈے منایا جا رہا تھا۔ اسے بھی آپ اتفاق نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے۔ ہو سکتا تھا کہ دس پندرہ روز قبل وارد ہو جاتا..... اور اس صورت میں گھر پر ہفتہ دس روز قیام کرکے شہید ڈے سے قبل اپنے عہدے کا چارج لینے روانہ ہو جاتا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شہید ڈے کے ایک روز دس دن بعد وارد ہوتا۔ یعنی شہید ڈے کی اس تقریب میں میری شرکت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ اس جہاز میں جگہ نہ ملتی جس سے میں امریکہ سے روانہ ہوا۔ یا اس ٹرین میں سیٹ نہ ملتی۔ جس سے میں نے بمبئی سے الہ آباد تک سفر کیا۔ میں تو یہی کہوں گا کہ وہ جہاز وہ ٹرین

گھنٹے لیٹ ہو جاتا یا ٹرین دس پندرہ گھنٹے لیٹ ہو جاتی۔ اور میں الہ آباد صبح پہنچنے کی بجائے شام کو یا رات کو پہنچتا۔ پھر تو اس تقریب میں میری شرکت ناممکن ہوتی۔ اپنے آپ تو میں نہیں گیا تھا، تقریب چار ڈنر۔ پروفیسر رُدرا آئے تھے مجھے بلانے۔ دعوت دینے۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ پروفیسر ردرا کو میری آمد کی خبر ہو گئی۔ میرے نوکر نے ان کے نوکر سے میری آمد کا ذکر نہ کیا ہوتا۔ اور ان کے نوکر نے اپنی مالکن سے اس واقعہ کا ذکر نہ کیا ہوتا اور اسی مالکن نے اپنے مالک سے اس ذکر کو نہ دہرایا ہوتا تو انہیں کیسے پتہ چلتا کہ میں آ گیا ہوں۔ اور وہ کیسے مجھے دعوت دینے آتے۔ لہٰذا جہاز یا ٹرین کے لیٹ ہو جانے اور میرے الہ آباد شام یا رات کو پہنچنے کی صورت میں (اگر کوئی اور اتفاق درپیش نہ ہوتا) پروفیسر ردرا کو میری آمد کی خبر نہ ہوتی۔ کیونکہ میرے نوکر کی ملاقات ان کے نوکر سے صبح کو ہوئی تھی۔

مگر میں سارا الزام اتفاقات کو نہیں دیتا۔ جو کچھ ہوا اس میں میری غلطیوں کا بھی اتنا ہی دخل ہے۔ جتنا اتفاقات کا۔ اولین غلطی جو مجھ سے سرزد ہوئی وہ یہ تھی کہ میں نے پروفیسر ردرا کی دعوت قبول کر لی۔ وہ بارہ بجے کے قریب تشریف لائے۔ بغلگیر ہوئے۔ کچھ امریکہ کا حال پوچھا کچھ اپنا سنایا ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ جن کے دوران میں میں نے اپنی نوکری کا ذکر کیا جسے سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور مجھے مبارکباد دینے لگے۔

رخصت ہونے سے قبل انہوں نے اچانک کہا۔ "امر شہید کو تو آپ اچھی طرح جانتے تھے!"

میں نے پوچھا۔ "کون امر شہید؟"

بولے "وہی امر شہید۔ اپنی یونیورسٹی کے۔"

میری سمجھ میں پھر بھی کچھ نہ آیا ــــ "میں سمجھا نہیں"

پروفیسر ردرا کے چہرے کا رنگ بدلا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ وہ میری لاعلمی کا یہ مطلب نکال رہے ہیں کہ میں امریکہ میں سات سال رہ کر بدل گیا ہوں اور اب اپنے دوستوں ...... کو پہچاننے سے بھی کتراتا ہوں۔ حالانکہ یہ غلط تھا۔ مگر پھر بھی مجھے پشیمانی سی ہوئی۔ یہ سوچ کر کہ پروفیسر ردرا نے شاید میرے بارے میں اتنی بری رائے قائم کر لی۔ میں نے معذرت پیش کی۔

"بات دراصل یہ ہے ددرا صاحب کہ میرا حافظہ کچھ کمزور ہو گیا ہے۔"
میں نے منہ کھولا تھا۔ پروفیسر صاحب کی رائے بدلنے کے لئے مگر نتیجہ الٹا نکلا اور نکلنا بھی الٹا ہی تھا۔ کیونکہ میرے جملہ کا مطلب نہیں نکل سکتا تھا۔ کہ میں واقعی امریکہ میں سات سال رہ کر اپنے پرانے دوستوں کو پہچاننے سے منکر ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ میرا حافظہ ذرا بھی کمزور نہیں ہوا تھا۔ لیکن وقت یہ آن پڑی تھی کہ پروفیسر ددرا جس شخص کا ذکر کر رہے تھے میں نے آج سے قبل اس کا نام بھی نہیں سنا تھا۔
ددرا صاحب نے میرے کمزوریٔ حافظہ کے اعتراف کو اعتراف جرم سے کم نہیں گردانا ۔"حافظے کمزور ہو جاتے ہیں ۔ مگر وہ شخصیتیں جنہوں نے ملک و قوم کی آزادی کی خاطر اپنی جانیں لٹا دیں ان کے نام نہیں بھولتے۔"
قریب تھا کہ اس بار میں حافظہ کی بے اعتباری کا سہارا لے کر پھر کوئی ایسی بات کہہ دوں جو پروفیسر ددرا کی نظروں میں مجھے قطعی ناقابل معافی ٹھہرائے کہ اچانک میرے حافظہ سے زیادہ میری گھبراہٹ نے میرا ساتھ دیا۔ او دنہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ شاید ددرا صاحب ہری پرکاش سکسینہ کا ذکر کر رہے ہیں۔
"میں بھی کتنا نالائق ہوں - آپ ٹھیک تو کہتے ہیں ۔ چند نام ایسے ہوتے ہیں جو فراموش نہیں ہو سکتے۔ آپ ہری پرکاش سکسینہ کا ذکر کر رہے ہیں۔؟"
پروفیسر صاحب نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا ۔ "میں بھی حیران تھا کہ امر شہید آپ کے کلاس فیلو تھے ۔ لیکن پھر بھی ...."
"آپ کی حیرت بجا ہے" میں نے کوشش کر کے پشیمانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے جہاں تک مجھے یاد ہے مرحوم کو امر شہید کا لقب اس وقت تک تو نہیں ملا تھا جب تک میں یونیورسٹی میں تھا۔"
"ہو سکتا ہے" ۔ انہوں نے میری بات کو قابل اعتنا نہ گردانتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے۔ بہر حال میں آپ سے کہنا چاہتا تھا کہ آج رات کو یونین حال میں شہید ڈے کے سلسلہ میں ایک میٹنگ ہو رہی ہے۔ اگر آپ بھی شرکت کریں تو بہتر ہو گا۔ میرا مطلب ہے اگر آپ بھی امر شہید پر کچھ کہیں تو اچھا ہو۔ آخر آپ امر شہید کے گہرے دوست تھے۔"

سوغات

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں" میں نے بغیر سوچے سمجھے کہا۔ اور رودرا صاحب چلے گئے۔

تو یہ میری پہلی غلطی تھی۔ "کیوں نہیں" اس گھبراہٹ کے عالم میں میرے منہ سے نکل گیا تھا جس میں رودرا صاحب نے مجھے پھنسا دیا تھا۔ میں ہری پرکاش کو اچھی طرح جانتا تھا مگر صرف ہری پرکاش کی حیثیت سے۔ جب اس کی موت واقع ہوئی تو میں یونیورسٹی میں تھا۔ مگر اس واقعہ کے چھ مہینے کے اندر اندر میں نے یونیورسٹی چھوڑ دی تھی۔ اور جب تک میں یونیورسٹی میں رہا مرحوم کو امر شہید کا اعزاز نہیں بخشا گیا تھا۔ مگر پروفیسر رودرا نے "امر شہید" سے میری نا علمی کو کچھ اس حقارت سے محسوس کیا تھا کہ میں اپنے تئیں قصوروار تصور کرنے لگا تھا۔ یہ میری غلطی تھی۔ مجھے اس آسانی سے بلا وجہ قصوروار نہیں بننا چاہیے تھا۔ یہ بھی میری غلطی تھی کہ میں نے بلا سوچے سمجھے "کیوں نہیں" کا وعدہ کر ڈالا۔ حالانکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ "کیوں نہیں" میں نے رودرا صاحب کے جملے کے اس ٹکڑے کے جواب میں کہی تھی جس میں مجھے یاد دلایا گیا تھا کہ میں "امر شہید" کا گہرا دوست تھا۔ لیکن اس "کیوں نہیں" کا مطلب ہر صحیح الدماغ شخص یہی نکالے گا کہ میں نے رودرا صاحب سے میٹنگ میں شرکت کرنے اور تقریر کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔

میں مقرر نہ تھا۔ نہ ہوں۔ اور نہ ہو سکتا ہوں۔ میں نے اپنی ساری زندگی میں صرف ایک بار تقریر کی ہے۔ جب میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اور میں نے ایک تقریری مقابلے میں شرکت کی تھی۔ اپنے والد صاحب کے اصرار پر اور اس شرط پر کہ تقریر وہ مجھے لکھ کر دیں گے۔ اور میں صرف اسے رٹنے کا کام کروں گا۔ اس کا جو انجام ہوا تھا وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ صرف دس بارہ سطریں دہرانے کے بعد تقریر کا سرا کھو گیا تھا۔ اور میں چند منٹ تک بیوقوفوں کی طرح اس سرے کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے کے بعد رو پڑا تھا۔

ہر حال یہ غلطی ایسی نہ تھی کہ اس کے نتائج سے بچنا لامحال ہوتا۔ ایک آسان راہ فرار یہ ہو سکتی تھی کہ وعدہ خلافی کر جاتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ رودرا صاحب جن کا میں بڑا لحاظ کرتا ہوں ناراض ہو جاتے۔ تو ان سے معافی مانگ لیتا۔ اور معاف نہ کرتے تو وہ اپنی ناراضگی میں خوش رہتے اور میں اپنی وعدہ خلافی میں۔ وہ تو نہ ہوتا جو ہوا۔ لہٰذا یہ ہوئی غلطی نمبر ۲ غلطی۔

سوغات

جب میں آٹھ بجے کے قریب یونین ہال پہنچا تو میٹنگ شروع ہو چکی تھی اور ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ددرا صاحب اور یونین کے عہدے داروں نے میرا پرجوش استقبال کیا۔ ۔ ۔ ۔ اور مجھے ڈائس پر جگہ دی گئی جہاں یونیورسٹی کے زیادہ تر اساتذہ تشریف فرما تھے۔ میں نے اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے سوچا کہ آزادی کے بعد یونین کی فضا کافی بدل گئی ہے۔ جن دنوں میں یونیورسٹی میں تھا ان دنوں شاذونادر ہی اساتذہ یونین کی میٹنگوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی ان میٹنگوں میں دھواں دھار اور کسی حد تک غیر ذمہ دار تقریریں ہوا کرتی تھیں۔ جن کا موضوع اکثر و بیشتر آزادی انگریزی کی غلامی۔ ستیہ گرہ۔ انقلاب اور اسی قسم کے مسائل ہوا کرتے تھے۔ چونکہ اپنا ملک اس وقت تک آزاد نہیں ہوا تھا۔ اور ہماری یونیورسٹی انگریزی حکومت کے زیر نگرانی تھی۔ اس لئے اساتذہ ان میٹنگوں میں شرکت کرنے سے کتراتے تھے۔ مگر اب زمانہ بدل چکا تھا۔ غیر ملکی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور اپنا دیس آزاد تھا۔ اس لئے پروفیسروں میں اب وہ جھجک اور ڈر باقی نہیں رہا تھا۔ جو انگریز کی غلامی اور اس کی حکومت کا اثر تھا

میں جب ہال میں داخل ہوا تو ایک صاحب بڑے جو شیلے انداز میں تقریر کر رہے تھے۔ شکل صورت سے طالب العلم لگتے تھے۔ اور ددرا صاحب نے جو میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے مجھے بتایا کہ وہ یونیورسٹی کے بہترین مقررین میں سے تھے۔ وہ "امر شہید" کی زندگی اور ان کے بلند کردار پر روشنی ڈال رہے تھے۔ میں نے ددرا صاحب سے پوچھا کہ کیا یہ صاحب ہری پرکاش سکسینہ یعنی "امر شہید" کو جانتے تھے تو انہوں نے کہا کہ شاید نہیں۔ مگر جہاں تک "امر شہید" کا تعلق ہے جاننے اور نہ جاننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ "امر شہید" کی شخصیت سے یونیورسٹی کا ہر طالب العلم بخوبی واقف ہے اور ان کے کارناموں کی داستانیں ہر سال اس ہال میں دہرائی جاتی ہیں۔

ددرا صاحب سے گفتگو کر نے اور ہال اور سامعین کا جائزہ لینے کے درمیان

اس جوشیلی تقریر کے کچھ حصے میرے ذہن میں داخل ہوتے رہے۔

"بھائیو اور دوستو۔ میں پھر کہوں گا کہ آج بھی ہمارے دیش کو "امر شہید" جیسے نڈر۔ جیالے اور جان نچھاور کرنے والے سپوتوں۔ جوانوں دیش سیوکوں کی ضرورت ہے۔ ان سپوتوں کی ضرورت ہے جو اس ملک کے ماتھے سے ہر کلنک کو اپنے خون سے دھو ڈالیں۔ ان جیالوں کی ضرورت ہے۔ جو دیش دیش کے کونے کونے میں اہنسا کا ڈنکا پیٹ دیں۔ ان بہادروں کی ضرورت ہے۔۔" اس مقام پر مقرر صاحب صحیح الفاظ ڈھونڈنے کے لئے رکے اور کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ جس پر قابو پانے کے لئے انہوں نے پانی کا ایک گھونٹ پیا۔ اتنے میں میرا ذہن جلوسوں پر لگی ہوئی نیتاؤں کی تصویروں کی طرف مڑ گیا۔

پھر جب میں نے تقریر کی طرف دھیان دیا تو مقرر صاحب فرما رہے تھے "اور دوستو! ۔ کتنی کٹھن تھی وہ لڑائی۔ بدیسی سامراج کی ساری شکتی اُمڈ آئی تھی اور اس کے مقابلے پر کون تھا۔ صرف ایک دیش سیوک۔ ایک رانا پرتاپ سنگھ۔ ایک شیواجی۔ ایک گرو گوبند سنگھ۔ میں جانتا ہوں اور آپ بھی جانتے ہیں کہ تھے تو بہت سے مگر ان سب کی آتماؤں کا نچوڑ۔ ان کا اس امر شہید کے شریر میں اتر آیا تھا۔ اور اس ایک شریر نے لوہے کی دیوار بن کر بدیسی سامراج اور اس کے پٹھوؤں کا مقابلہ کیا۔ اور اپنی آتما کا بلیدان دے کر انہیں نرکھ میں جھونک دیا۔ دیش کو سوتنترتا سے قریب کر دیا۔ اور آزادی کی اوشا کے گالوں پر اپنے خون سے گلال مل دیا۔ تو دوستو!"

میں دوراصاحب سے کچھ پوچھنے لگا اور چند منٹ بعد جب میرا ذہن پھر تقریر کی طرف پھرا تو ———

"ایک طرف انگریزی سامراج کی ساری شکتی اس کا سارا ہی سپاہیوں اور بندوقوں کا روپ دھارے لوہے کی دیوار بنا کھڑا تھا اور دوسری طرف سے کیا تھا دوسری طرف؟ ـــ ایک غلام دیس کے نہتے۔ کمزور مگر جان کی لگا دینے والے نوجوانوں کی ایک لہر جیسے امر شہید ایک ہاتھ میں ترنگا جھنڈا لئے اور آگے۔ اور آگے اور آگے بڑھا رہے تھے۔ اور جب

یہ لہر لوہے کی دیوار سے ٹکرائی تو ایسا لگا کہ دیوار کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ ایسا لگا جیسے امر شہید نے لوہے کی اس دیوار میں ایک دو نہیں ہزاروں بڑے بڑے چھید کر ڈالے ہیں۔ جن میں سے وہ لہر ہزاروں دھاروں کا روپ دھار کر مچلتی ہوئی۔ تڑپتی ہوئی نکل جائے گی۔ اور......"

اس بار میری توجہ مقرر اور تقریر سے ہٹی تو میری نظریں سامعین کا جائزہ لینے لگیں۔ ان میں زیادہ تر اسٹوڈنٹ تھے جو بجز دو ایک کے کوٹ پتلون میں ملبوس تھے۔ ان میں سے کچھ تقریر سن رہے تھے۔ کچھ ان لڑکیوں کی طرف دیکھ رہے تھے جن کے بیٹھنے کے لئے ڈائس کے قریب انتظام کیا گیا تھا (ان میں سے ایک لڑکی غضب کی خوبصورت تھی) — اور کچھ ڈائس پر بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لے رہے تھے۔

تالیوں کے شور نے میری توجہ کو سامعین کی طرف سے ہٹا دیا۔ ایک نئی تقریر شروع ہونے والی تھی اور نئے مقرر کا تعارف کرایا جا رہا تھا۔ تعارف کے دوران میں بتایا گیا کہ انہوں نے امر شہید پر ایک کتاب بھی لکھی ہے جس کا مطالعہ ہر ویلش بھگت کے لئے ضروری ہے۔

نئے مقرر نے سارا زورِ بیان امر شہید کی "لامثال" شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے پر صرف کیا۔ اور امر شہید کی مختصر مگر "مکمل" زندگی کے بہت سے واقعات بیان کئے۔ جن کا تعلق بچپن لڑکپن اور جوانی کے ایام سے تھا اور جن میں سے ہر ایک اس بات کا ثبوت تھا کہ "بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔" ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مقرر نے امر شہید کی زندگی پر کافی ریسرچ کی ہے۔ اور ان کی زندگی کے مختلف ادوار کے ایسے واقعات کو کھوج نکالا ہے۔ جن سے میں کبھی واقف نہ تھا۔ حالانکہ میں امر شہید کا بہت گہرا دوست تھا۔

اس تقریر کے دوران میں کسی نے پیچھے سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے اپنی طرف مخاطب کیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو جوگندر پال مسکرا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی جوگندر میرا اور امر شہید کا ہم جماعت تھا۔ وہ کرسی کھینچ کر میرے قریب آ گیا اور کھسر پھسر کرنے لگا۔ میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ وہ ایم اے کر کے یونیورسٹی میں لکچرار ہو گیا تھا

اور آج تک پکچر رہی ہے۔ جوگندر بہت ذہین لڑکا تھا۔ اس نے ہمیشہ فرسٹ ڈویژن پائی۔ اور میری اور امر شہید کی تھرڈ ڈویژنوں کا سہرا بھی اسی کے سر رہا۔ کیونکہ جب امتحان قریب آتے تھے تو وہ دوستی چھوڑ کر میرا استاد بن جاتا۔ اور مجھے سال بھر کا کورس ایک مہینے میں گھول کر پلانے کی کوشش کرتا۔

جوگندر کی کھسر پھسر جاری تھی کہ تقریر ختم ہوگئی تھی۔ اور میری باری آگئی۔ صدر صاحب اعلان کر رہے تھے کہ اب میں تقریر کروں گا۔ اور سامعین کو یہ بھی بتا رہے تھے کہ میں کون تھا۔ کہاں تھا۔ کون ہوں۔ کیا ہوں۔ اور یہ بھی کہ امر شہید سے میرے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس وقت جبکہ امر شہید ڈے منایا جا رہا ہے میں الہ آباد میں موجود ہوں۔ اور اس بات پر رضامند ہو گیا ہوں کہ اس جلسہ میں شرکت کر کے حاضرین کو اپنے زرین خیالات سے مستفیض کروں۔"

کرسی سے اٹھتے وقت میرے سارے بدن میں ایک قسم کا رعشہ آگیا۔ اور لمحہ بھر کے لئے مجھے خیال آیا کہ کوئی بہانہ کر کے گلو خلاصی کر لوں۔ مگر بہانہ کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ اور میں دو قدم چل کر مائک کے سامنے پہنچ گیا۔ میرا حلق سوکھ رہا تھا۔ میں نے دو تین بار تھوک نگلا۔ مڑ کر جوگندر کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اور پھر میری نظریں اس بلا کی خوبصورت لڑکی طرف اٹھ گئیں جو اب بالکل میرے سامنے تھی۔ وہ بہت انہماک سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ یکایک مجھے احساس ہوا کہ میں اس مجمع میں سب سے خوبصورت شخص ہوں۔ میرا سوٹ ڈیڑھ سو ڈالر کا ہے۔ میری ٹائی دس ڈالر کی ہے میں جوان ہوں۔ اور یہ لڑکی میری طرف اس لئے دیکھ رہی ہے کہ مجھے دیکھ کر اس کے دل میں کچھ ہونے لگا ہے اس خیال کا آنا تھا کہ میرے حلق کی خشکی غائب ہوگئی۔ اور میں کھنکھار کر جو بولنا شروع کیا تو انگریزی کے نو دس جملے لگاتار میرے منہ سے ایسے نکلے جیسے بندوق میں سے گولی نکلتی ہے۔ میں بہت خوش ہوا۔ جملے سب کے سب صحیح تھے۔ اور امریکن لہجہ میں ادا ہوئے تھے۔ میرا سینہ پھولنے لگا۔ اور میں نے چار پانچ اور جملے اسی روانی سے جھاڑ دیئے۔ مگر اس دفعہ میرے کانوں میں سامعین کی طرف سے کچھ بھنبھناہٹ سی آئی۔ اور نہ جانے کیوں مجھے ایک دم یہ خیال آیا یہ بھنبھناہٹ ناپسندیدگی کا اظہار ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے خیال بھی آیا کہ مائک کے سامنے آنے کے بعد سے اب تک لگاتار میری نظریں اس بلا کی حسین لڑکی کی طرف لگی ہوئی ہیں۔

میں نے سوچا کہ شاید میری یہ حرکت طالب علموں کو پسند نہیں آئی۔ اس خیال کا آنا تھا

کہ میری تقریر کی روانی غائب ہوگئی۔ اور میں گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ لیکن پروفیسر ورما نے آگے جھک کر آہستہ سے کہا کہ لڑکے آپ کو انگریزی میں نہیں۔ راشٹر بھاشا ہندی میں سننا چاہتے ہیں۔ میں اور گھبرا گیا۔ اور میں نے ورما صاحب سے کہا کہ مجھے تو ہندی نہیں آتی۔ ہاں اردو میں کوشش کر سکتا ہوں وہ بولے "ٹھیک ہے۔ اردو بھی ہندی ہے۔"

یہ سن کر مجھے گونہ اطمینان ہوا۔ اور میں نے اردو۔ یعنی ہندی میں بولنا شروع کیا۔ اور اپنی نظروں کو تنبیہہ کر دی کہ وہ اس بلا کی خوبصورت لڑکی کی طرف بار بار نہ بھٹکیں۔

چند جملوں میں اپنے سامعین سے انگریزی میں تقریر کرنے کے لئے معافی کا خواستگار ہو کر میں نے اپنے اور امرشہید کے گہرے تعلقات کا ذکر شروع کیا۔

"..... تو مترو۔ میں اپنے حافظے پر زور ڈال کر آپ کو سکینہ بابو کی زندگی کے چند ایسے واقعات سناؤں گا جن کا مجھ کو ذاتی علم ہے۔"

میں نے ابتداء امرشہید سے کی تھی۔ مگر تقریر میں جب ذرا روانی آئی تو امرشہید کی خود بخود "سکینہ بابو" نے لے لی۔ حالانکہ میں ہر ایک کاش سکینہ کو نہ امرشہید اور نہ سکینہ بابو کہا کرتا تھا میرے لئے وہ صرف ہری تھے۔

میں اپنے حافظے پر زور ڈال کر واقعات کے موتی نکالتا رہا۔ اور انہیں حاضرین کے سامنے پیش کرتا رہا۔ اس طرح دس پندرہ منٹ گزر گئے۔ مگر اس دوران میں ان واقعات کا جو میں نے بیان کئے ایک مرتبہ بھی پُر جوش تالیوں کے ساتھ خیر مقدم نہیں کیا گیا۔ مگر میں یہ سمجھا کہ سامعین اس انہماک سے میری تقریر سن رہے ہیں کہ تالیوں اور واہ واہ کی گنجائش ہی نہیں۔ اور میری تقریر بہتی رہی۔

"یہ ۱۹۳۹ء کی بات ہے۔ جنم اشٹمی کی رات کو جھانکی دیکھنے کا پروگرام تھا۔ ہمارے ہاسٹل کے پیچھے ایک تانگے والا رہا کرتا تھا جس کا نام کلو تھا۔ ہم لوگ اکثر اسی کے تانگے پر سول لائنز یا شہر جایا کرتے تھے۔ طے کیا گیا کہ کلو کے تانگے میں آج رات سارے شہر کا چکر لگایا جائے۔ اور جہاں جہاں جھانکی لگی ہو وہاں جایا جائے۔ جب سب جانے کے لئے تیار ہو گئے اور کلو اپنا تانگہ لے آیا تو سکینہ بابو نے جانے سے انکار کر دیا۔ ہم لوگوں نے وجہ پوچھی تو بولے کہ میں ایک شرط پر جاؤں گا۔ وہ شرط یہ تھی کہ ہم میں سے ہر ایک کے بدن پر صرف ایک کپڑا ہو۔ کڑی شرط تھی۔ کیونکہ سردی غضب کی پڑ رہی تھی۔ مگر ہمارے گروپ

میں چونکہ سکینہ بالو کی حیثیت لیڈر کی سی تھی۔ اس لئے کسی کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ فوراً ان کی شرط ماننے سے انکار کر دیتا۔ اور پھر شرط تھی بھی ذرا دلچسپ۔ لہٰذا مان لی گئی۔ شرط کا ایک کپڑا پتلون، دھوتی یا پاجامہ ہی ہو سکتا تھا۔ مگر ہم سب کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب سکینہ بالو اپنے کمرے سے لنگوٹ کستے ہوئے نکلے.....؟

سامعین کی خاموشی ٹوٹی۔ مگر یہی جھنجھناہٹ۔

میں نے تقریر جاری رکھی — گھٹا ہوا سر۔ لمبی چٹیا۔ بدن پر تیل ملا ہوا اور کالی لنگوٹ"

یکایک مجھے احساس ہوا کہ یہ جھنجھناہٹ نہیں تھی بلکہ سیمنٹ کے فرش پر جوتے رگڑنے کی آواز تھی جو بلند ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے غصہ آیا کہ میں تو ان لوگوں کو امر شہید کی زندگی کے ایسے واقعات سنا رہا ہوں جو انہوں نے آج تک نہ سنے ہوں گے اور یہ ہیں کہ جوتے رگڑ رگڑ کر.....

میں نے قصہ مختصر کیا اور دوسرا واقعہ بیان کرنے لگا۔ یہ واقعہ ایک لڑکے کے کمرے سے گھی غائب کرنے اور رات کو اس پر غلاظت سے بھری صلاحی چھوڑنے کا تھا۔ جس میں گروپ لیڈر کی حیثیت سے امر شہید پیش پیش تھے۔ ابھی قصے کا اختتام نہیں ہوا تھا کہ ایک ٹماٹر میرے جوتوں کے پاس آ گرا۔ میں نے مجمع پر نظر ڈالی تو ایک اور ٹماٹر مجھے اپنی طرف پرواز کرتا ہوا نظر آیا۔ میں نے سر جھکا لیا۔ اور یہ ٹماٹر میرے سر کو چھوتا ہوا نکل گیا۔

میں نے گھبرا کر ورما صاحب کی طرف دیکھا جو اپنی کرسی چھوڑ رہے تھے۔ جب تک وہ لڑکوں سے اپیل کرتے رہے کہ وہ میری تقریر کو غور سے سنیں۔ اور مہمان کے ساتھ بدسلوکی نہ کریں۔ تب تک میں بحیرۂ حیرت میں غوطے لگاتا رہا کہ آخر یہ لڑکے کیوں میری تقریر سے لطف اندوز نہیں ہو رہے ہیں۔ اور کیوں مجھے ٹماٹروں کا نشانہ بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ کیونکہ یہ لمحہ فکر و حیرت کا نہیں فیصلے کا وقت تھا۔ ایسے فیصلے کا جو شرم و حیا کی فکر کو میلوں پیچھے چھوڑ دے۔ مگر میں وہ فیصلہ نہیں کر سکا۔ اور ورما صاحب نے اپنی اپیل ختم کر کے میرے کان میں آہستہ سے کہا میں اپنی تقریر کو زیادہ طول نہ دوں۔ تو میں نے پھر تقریر شروع کر دی۔ اور گلا صاف کر کے امر شہید کی شہادت کا وہ واقعہ بیان کرنا شروع کر دیا جس کا مجھے ذاتی علم تھا۔ اور جس پر مجھے اپنی تقریر ختم کرنی تھی۔

پہلے میں نے ۱۹۴۲ء کی اس تحریک کا ذکر کیا جس نے یونیورسٹی کے زیادہ تر طالب علموں

کراچی گرفتت میں لے لیا تھا۔ اور پھر اس دن کا جس دن وہ جلوس نکالا گیا تھا۔ جس میں میں اور سکینہ بابو دونوں شامل تھے۔ یہ جلوس اس جلسے کے بعد نکالا گیا تھا جو یونین ہال میں منعقد ہوا تھا اور جس میں مَیں نے اور بنا امر شہید نے شرکت کی تھی۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد طے پایا تھا کہ ایک جلوس نکالا جائے جو شہر کی مختلف سڑکوں کا چکر لگانے کے بعد کلکٹر کے دفتر کے سامنے مظاہرہ کرے۔ جلوس جب ہمارے ہاسٹل کے سامنے سے گذرا تو میں اور سکینہ بابو بھی اس کے ساتھ ہو لئے۔ چونکہ ہم لوگوں کو کپڑے تبدیل کرنے میں کچھ وقت لگ گیا تھا اس لئے ہم دونوں جلوس کے پیچھے تھے۔ جلوس جب سائنس کالج کے گیٹ پر پہنچا تو وائس چانسلر اور کئی سینئر پروفیسر راستہ روک کر کھڑے ہو گئے اور منت سماجت کرنے لگے کہ جلوس یونیورسٹی کی حدود سے باہر نہ جائے۔ تھوڑی دیر بحث ہوتی رہی لڑکے مصر تھے کہ جلوس ضرور یونیورسٹی کی حدود سے باہر جائے گا۔ یکایک میں نے اور سکینہ بابو نے جلوس کے پیچھے سے نعرہ لگایا۔

"بیڑی بیڑی کی جھنکار"

جواب ملا۔ "انقلاب زندہ باد"

ہم نے پھر نعرہ لگایا۔ "بچے بچے کی پکار"

جواب آیا۔ "انقلاب زندہ باد"

... بس پھر کیا تھا۔ مانو طوفان پھٹ پڑا۔ سیلاب آ گیا۔ وہ اور وائس چانسلر صاحب اور پروفیسر صاحبان کو ہمارا راستہ چھوڑنا پڑا۔ مگر جب ہم سڑک پر آئے تو ہم نے دیکھا کہ دوسری طرف مسلح پولیس قطار باندھے کھڑی ہے۔ پولیس کو دیکھتے ہی لڑکوں کا جوش اور تیز ہو گیا اور "انقلاب زندہ باد" کے پے در پے کئی فلک شگاف نعرے بلند ہوئے۔ کلکٹر پولیس کے ہمراہ تھا۔ اس لئے آگے بڑھ کر لڑکوں سے کہا کہ وہ واپس یونیورسٹی کی حدود میں چلے جائیں ورنہ پولیس کو گولی چلانے کا حکم دیدیا جائے گا۔ گولی کا لفظ سننا تھا کہ لڑکے بپھر گئے۔ اور کئی اور فلک شگاف نعرے بلند ہوئے۔ کلکٹر نے پیچھے ہٹ کر اعلان کیا کہ وہ دس تک گنیگا اور اگر اس دوران میں لڑکے واپس نہ ہوئے تو وہ گولی چلانے کا حکم دیدے گا۔ ایک دم سناٹا چھا گیا۔ کلکٹر نے گنتی گننا شروع کی ایک ... دو

تین ۔ چار ۔ پانچ ۔ چھے ۔ سات ۔ آٹھ ۔ نو اور دس ۔ مگر لڑکے اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں ۔ پھر کلکٹر نے ایک پولیس آفیسر سے کچھ کہا اور پولیس آفیسر نے سپاہیوں کو کوئی حکم دیا ۔ جسے سن کر انہوں نے اپنی بندوقوں کو سنبھالا ۔ پھر اس نے فائر کرنے کا حکم دیا ۔ سارے لڑکے زمین پر اوندھے لیٹ گئے ۔ اور ساتھ ہی بہت سی گولیوں کے چلنے کی آواز آئی ۔ فائر ہوا میں کئے گئے تھے ۔ کلکٹر نے ایک بار پھر لڑکوں سے کہا کہ وہ واپس چلے جائیں ورنہ اس بار گولی ان پر چلائی جائیگی ۔ مگر لڑکے ویسے ہی لیٹے رہے ۔

"میں اور سکینہ بابو پاس پاس لیٹے ہوئے تھے ۔ میں نے گردن اٹھا کر دیکھا تو کلکٹر کو پھر اسی پولیس آفیسر سے کچھ کہتے ہوئے پایا ۔ میں نے سکینہ بابو سے کہا کہ کلکٹر ۔ پولیس آفیسر کو گولی چلانے کا حکم دے رہا ہے ۔ اور اب پولیس آفیسر سپاہیوں سے کچھ کہہ رہا ہے ۔ اور اب سپاہی اپنی بندوقیں سنبھال رہے ہیں ۔ اور اب وہ اپنی بندوقوں کا رخ ہماری طرف ۔ ۔ ۔ ۔

یکایک سکینہ بابو اٹھ کھڑے ہوئے ۔ میں نے کوشش کی کہ ان کو ٹانگ سے پکڑ کر گرا لوں مگر انہوں نے اپنی ٹانگ کو اس زور سے جھٹکا کہ میرا ہاتھ پھسل کر اس جگہ گرا جہاں وہ لیٹے ہوئے تھے ۔ مجھے وہ جگہ گیلی لگی ۔ حالانکہ جب ہم لیٹے تھے تو زمین کا وہ حصہ بالکل خشک تھا ۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا ۔ سکینہ بابو کی پیٹھ پولیس کی طرف تھی اور پھر ایک صرف ایک گولی چلنے کی آواز آئی ۔ گولی سکینہ بابو کی پیٹھ میں لگی اور سکینہ بابو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ابھی میرا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ لڑکوں نے ڈائس پر یورش کر دی اور اس وقت تک میری سمجھ میں کچھ نہ آیا جب تک ایک مکا ۔ ایک تھپڑ اور ایک دھول بیک وقت میرے سر اور منہ پر نہیں پڑا ۔ اس یورش کا نشانہ میں تھا ۔ رودرا صاحب اور دوسرے پروفیسروں نے مجھے بچانے کی بہت کوشش کی ۔ مگر بے سود ۔ اتنے بہت سے لڑکوں کے سامنے ان کی کیا بن پڑتی ۔ آن کی آن میں میں ڈائس پر دراز تھا ۔ اور مجھ پر مکوں اور تھپڑوں کی بارش ہو رہی تھی ۔ اور ایک مرتبہ جب یورش قدرے کم ہوئی اور اپنی آنکھوں پر لمحہ بھر کے لئے ہاتھ اٹھایا تو دیکھا کہ اس خوبصورت لڑکی کا دایاں ہاتھ جس میں اس کی چپل

ٹنگی ہوا میں معلق ہے۔ میں نے فوراً آنکھیں بند کرلیں اور دوسرے لمحے وہی چپل چٹاخ سے میرے منہ پر پڑی۔

کوئی بیس منٹ بعد جب پروفیسر مدر احمد صاحب مجھ سے بہت پرخلوص معافی مانگ رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ جوگندر کھڑا مسکرا رہا ہے۔ اور جب وہ سہارا دے کر مجھے ہال سے باہر لئے جا رہا تھا تو اس نے میرے کان میں سچ بولنے کے بارے میں کچھ کہا جسے میں جیتے جی نہیں بھول سکتا۔

ممتاز شیریں

"یاں کوئی خریدار نہیں جنسِ گراں کا"

یہ ایک عجیب بات ہے کہ کس طرح ایک چھوٹا قصبہ اپنی خبر رکھتا ہے اور اپنے سارے حصوں کی فرداً فرداً خبر رکھتا ہے۔ اگر ہر مرد اور ہر عورت اور ہر بچہ بندھے ہوئے اصولوں اور ایک بنے بنائے سانچے پر چلے۔ ان میں سے کوئی اصولوں کو نہ توڑے۔ ایک الگ راہ اختیار نہ کرے اور نہ کوئی نیا تجربہ کرے اور قصبہ کی زندگی ہموار سطح اور سکون کو مدہم مدہم نہ کرے تو ہر فرد ایک مکمل یکائی میں گم ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ان میں سے ایک بھی اس بنے اور آزمائے ہوئے سانچے سے ایک قدم آگے نکل جائے تو قصبے کے لوگ اعصاب زدہ ہو جاتے ہیں اور گاؤں کی حساس نسوں پر یہ خبر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتی ہے

یوں لاپیز کے شہر میں صبح سویرے یہ خبر پہنچ گئی کہ کینو آج اپنا موتی بیچنے والا ہے۔ جھونپڑوں میں رہنے والے پڑوسی یہ بات جانتے تھے، خوطہ زن اور ماہی گیر اس سے واقف تھے۔ یہ خبر ترکاری بیچنے والے چینیوں کو بھی معلوم تھی۔ اور یہ خبر گرجا گھر تک جا پہنچی تھی۔ آلٹر کے لڑکوں نے اسے ایک دوسرے کو سرگوشیوں میں سنایا تھا۔ اور یہ الفاظ رینگتے ہوئے رعباؤں کے پاس پہنچے تھے۔ گرجا گھر کے سامنے بیٹھنے والے بھیک منگے آپس میں اس کی باتیں کر رہے تھے۔ کیونکہ اس خوش نصیبی کے پھل کا محصول انہیں سب سے پہلے ملنے والا تھا۔ ننھے ننھے لڑکے یہ خبر سن کر مسرور اور بے چین تھے۔

لیکن جو لوگ سب سے زیادہ بے چینی سے منتظر تھے وہ موتی کے سوداگر تھے۔ اور دن نکلتے ہی وہ اپنے اپنے دفتروں میں چھوٹے چھوٹے مخملی ٹرے لے بیٹھے۔ اور موتیوں کو اپنی انگلیوں میں گھماتے ہوئے سوچنے لگے کہ آج وہ اپنا پارٹ کیسے ادا کریں گے!

یہ تصور کر لیا گیا تھا کہ موتیوں کے تاجر اپنی اپنی انفرادی تجارت کرتے تھے

اور ماھی گیروں کے لائے ہوئے موتیوں کی الگ الگ قیمتیں چکاتے تھے۔ کسی زمانے میں یہی ہوا کرتا تھا۔

لیکن یہ نقصان دہ ثابت ہوا تھا۔ کیونکہ ان میں سے کوئی ایک تاجر اچھا موتی دیکھ کر جوش میں بہت اونچی قیمت لگا دیتا ہے۔ اس سے خواہ مخواہ روپوں کا نقصان ہوتا تھا۔ اب صرف ایک ہی سوداگر تھا اور اس کے مختلف ایجنٹ تھے اور یہ سارے ایجنٹ جو اپنے اپنے دفتروں میں بیٹھے کینو کا انتظار کر رہے تھے۔ پہلے سے طے کر چکے تھے کہ اس موتی کی کتنی قیمت لگائیں گے۔ کس حد تک بڑھائیں گے۔ اور کیا طریقہ استعمال کریں گے۔ حالانکہ ان ایجنٹوں کو اپنی تنخواہوں کے علاوہ اور کوئی کمیشن نہ ملتا تھا۔ تاہم سب مضطرب اور مشتاق تھے۔ کیونکہ شکار شوق کو تیز تر کرتا ہے۔ شکار کو پھانسنے میں اور قیمتیں توڑنے میں انہیں لطف آتا تھا جو جتنی قیمت کم کر سکتا اتنا ہی کامیاب مانا جاتا۔ ہر شخص اپنی بساط بھر کوشش کرتا ہے، اور اپنا فرض بہتر سے بہتر طریقہ پر انجام دینا چاہتا ہے۔ خواہ اسے کوئی صلہ ملے یا نہ ملے۔ اور ایک موتی کا خریدار آخر خریدار تھا۔ اور سب سے کامیاب خریدار وہ تھا جو کم سے کم قیمت میں خریدے۔

اس صبح سورج زرد اور گرم تھا۔ سورج نے دھانہ اور خلیج کی نمی کھینچ کر، ہوا میں چمکیلے، رنگین گلوبند سے تان دئے تھے۔ ہوا ان میں تھوک رہی تھی اور منظر غیر مادی اور غیر حقیقی تھا۔ شہر کے شمالی حصہ کی طرف ایک منظر گویا ہوا میں معلق نظر آتا تھا۔ یہ ایک پہاڑ کا منظر تھا جس کی اونچائیوں پر سرو شمشاد کے درخت تھے اور ان درختوں کے درمیان ایک بلند چوٹی اوپر اٹھی ہوئی تھی۔

اور آج صبح کشتیاں ساحل پر کھینچی کھڑی تھیں۔ آج ماہی گیروں میں سے کوئی غوطہ لگانے اور موتی ڈھونڈنے نہیں گیا تھا۔ کیونکہ آج بہت کچھ ہونے والا تھا۔ جب کینو اپنا شاندار موتی بیچنے کے لئے شہر جا رہا تھا۔

ساحل پر اپنی اپنی جھونپڑیوں میں کینو کے ہمسائے ناشتہ کر رہے تھے۔ مستقل باتیں کرتے ہوئے وہ بڑی دیر سے کھا رہے تھے۔ انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا کہ اگر انہیں موتی ملتا تو وہ کیا کچھ نہ کرتے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ وہ موتی کو نذر اللہ ..... کے

طور پر روم کے مقدس پوپ کی خدمت میں بھیجتا۔ دوسرے نے کہا کہ وہ اپنے خاندان کی اور اپنے گھر والوں کی روحوں کو ثواب پہنچانے کیلئے ایک ہزار سال کے لئے گرجا میں عشائے ربانی کی قیمت ادا کرتا۔ ایک اور کا خیال تھا کہ یہ موتی بیچ کر شہر لاپیز کے سارے غریبوں میں روپیہ تقسیم کر دیتا۔ چوتھے نے سوچا کہ موتی سے کتنی اچھی اچھی چیزیں حاصل کی جا سکتی تھیں۔ کتنوں کو خیرات دی جا سکتی تھی، کتنوں کو بچایا جا سکتا تھا، کتنی امداد کی جا سکتی تھی، اگر صرف روپیہ ان کے پاس ہوتا۔ سب ہمسایوں نے یہ امید ظاہر کی کہ دولت کینو کو مغرور بنا دے گی حرص و ہوس، نفرت اور دشمنی، بے رحمی اور غرور کے بد ترین اثرات کینو کے جسم سے نکلیں گے۔ کینو اپنے قصبہ میں محبوب تھا۔ کتنے افسوس کی بات ہوگی اگر یہ موتی اسے یوں تباہ کر دے! اور انہوں نے کہا "اس کی اتنی اچھی بیوی جوانا، اس کا خوبصورت ننھا بچہ کویوٹیٹو اور آئندہ جوانا کے بطن سے پیدا ہونے والے بچے، کتنے افسوس کی بات ہوگی اگر یہ موتی ان سب کو تباہ و برباد کر دے!"

کینو اور جوانا کے لئے یہ ان کی زندگی کی یکتا اور بے مثال صبح تھی۔ اس کا مقابلہ صرف اس صبح سے کیا جا سکتا تھا جب ان کا پہلوٹھی کا بچہ پیدا ہوا تھا۔ آج کے دن سے ہر بات ہر کام کا آغاز ہونے والا تھا۔ آج کے بعد وہ کہیں گے یہ اس وقت سے دو سال پہلے کی بات ہے جب ہم نے موتی فروخت کیا تھا یا یہ کہ یہ موتی بیچنے کے دو ہفتے کی بات تھی۔ جوانا نے آج موقع کی اہمیت کا لحاظ کرتے ہوئے ساری احتیاطوں کو پرے پھینکا۔ کویوٹیٹو کو وہ لباس پہنایا جو اس کے بپتسمہ کے لئے تیار کر رکھا تھا اور اس وقت کے لئے رکھ چھوڑا تھا جب ان کے پاس پیسے ہوں گے اور وہ اپنے بچے کا بپتسمہ کرائیں گے۔ پھر جوانا نے اپنے بالوں میں کنگھی کی اور انہیں دو چوٹیوں میں گوندھ کر ان کے سروں پر سرخ ربن سے پھول باندھے۔ اس نے بیاہ کے دن کا عروسی لہنگا پہنا اور جب سورج آسمان کی ایک چوتھائی اونچائی تک چڑھ آیا وہ بالکل تیار تھے۔ کینو کے پھٹے ہوئے کپڑے کم از کم صاف دھلے ہوئے تھے۔ یہ چیتھڑے آج وہ آخری مرتبہ پہنے گا کیونکہ کل یا ممکن ہے آج دوپہر ہی وہ نئے کپڑے خریدے۔

پڑوسی اپنی اپنی جھونپڑیوں کے سوراخوں سے کینو کے دروازے پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ وہ سب کے سب کپڑے پہنے ہوئے باہر جانے کے لئے تیار تھے۔ موتی کی فروخت کے لئے کینو اور جوانا کے ساتھ مل کر جانے میں انہیں کسی قسم کی جھجک نہ تھی۔ یہ پہلے سے طے شدہ بات

تھی۔ یہ ایک تاریخی موقع تھا۔ اگر اس موقع پر وہ ساتھ نہ جاتے تو یہ ان کا پاگل پن ہوتا بلکہ ایک غیر دوستانہ بات ہوتی۔

جوانا نے اپنی شال بڑی احتیاط سے سر پر اوڑھی۔ اس کا ایک لمبا سرا کہنی پر سے نکال کر بغل کے نیچے ایک جھولا سا بنا لیا اور کویوٹیٹو کو اس میں اپنے بازو کے سہارے اس طرح بٹھایا کہ وہ سب کچھ دیکھ سکے، اور شاید آئندہ یاد بھی رکھ سکے۔ کینو نے اپنی بڑی سی چٹائی ہیٹ سر پر رکھی اور ہاتھ سے چھو کر دیکھا کہ ہیٹ سر پر برابر رکھی ہوئی ہے، کہیں آگے پیچھے تو نہیں ہو گئی؟ اس نے ہیٹ ایک طرف جھکا کر ٹیڑھی نہیں پہنی تھی جیسے کہ لاابالی، غیر ذمہ دار، مجرد نوجوان پہنتے ہیں۔ اور نہ یہ چپٹی جیسے بڑے بوڑھے پہنتے ہیں بلکہ اسے پیشانی پر ذرا سا آگے کو جھکا کر پہنا، تاکہ اس سے سنجیدگی اور قوت کا احساس ہو۔ کسی شخص کی ٹوپی کے جھکاؤ میں بہت کچھ نظر آ جاتا ہے۔ کینو نے پاؤں میں کھلے سینڈل پہنے اور چمڑے کی پٹیوں کو ایڑیوں پر سے کس لیا۔ اس کا شاندار موتی ہرن کے چمڑے کے ایک ٹکڑے میں لپٹا ہوا ایک چھوٹے سے چرمی بیگ میں رکھا تھا اور یہ تھیلی کینو نے اپنی قمیص کی جیب میں رکھ لی تھی۔ اس نے اپنے کمبل کو احتیاط سے تہ کر کے کندھے پر ڈال لیا۔ اب وہ بالکل تیار تھی۔

کینو نے ایک عجب آن بان اور گھمبیرتا سے گھر کے باہر قدم رکھا اور جوانا ننھے کویوٹیٹو کو لیے اس کے پیچھے پیچھے ہو لی اور جب وہ دریا کی طغیانی سے دھلی ہوئی سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے شہر کی طرف چلے تو ہمسائے بھی ان کے ساتھ ساتھ ہو لیے۔ جہاں جہاں سے وہ گزرتے تھے یوں معلوم ہوتا تھا گویا گھر آدمیوں کو اگل رہے ہیں اور دروازے بچوں کو تھوک رہے ہیں۔ لیکن یہ سب لوگ پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ موقع کی سنجیدگی کا لحاظ کرتے ہوئے صرف ایک آدمی کینو کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور یہ اس کا بڑا بھائی خوان ٹوماس تھا۔

خوان ٹوماس نے اپنے بھائی کو آگاہ کیا۔ "تمہیں احتیاط برتنی چاہیے۔ کہیں موتی کے تاجر تمہیں دھوکا نہ دیں۔" اس نے کہا۔

"ہاں، میں بہت محتاط رہوں گا۔" کینو نے بھائی سے اتفاق کیا۔

"ہمیں یہ نہیں معلوم کہ دوسرے شہروں میں موتیوں کی کیا قیمت دی جاتی ہے اور ہم کسی مناسب قیمت کا کیسے اندازہ لگا سکیں گے، جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ یہ موتی

کہ سوداگر دوسرے شہر میں ان موتیوں کو کس قیمت پر فروخت کرتے ہیں؟"

"بالکل درست" کینو نے کہا "لیکن ہم یہ کیسے جان سکیں گے ہم تو بس اپنے قصبے میں رہتے ہیں۔ باہر کے بڑے شہروں کی ہمیں کیا خبر؟"

جیسے جیسے وہ شہر سے قریب ہوتے گئے ان کے پیچھے ہجوم بڑھنے لگا۔

نوان ٹوماس اپنی گھبراہٹ اور اضطراب کو چھپانے کے لئے بولتا ہی رہا۔

"تمہاری پیدائش سے پہلے کی بات ہے، کینو!" اس نے کہا "پرانے لوگوں نے اپنے موتیوں کے لئے زیادہ قیمت حاصل کرنے کا ایک طریقہ سوچا تھا۔ انہوں نے سوچا یہ بہتر ہوگا اگر انہیں کا ایک ایجنٹ ان کے موتی براہ راست دارالسلطنت کو لے جاکر فروخت کرے اور نفع میں اپنا کمیشن لے لے۔"

کینو نے اس بات پر سر ہلایا۔ "ہاں، میں جانتا ہوں۔ یہ بہت اچھا خیال تھا۔"

اور انہوں نے ایک آدمی کا انتخاب کیا، سارے موتی ایک ساتھ جمع کئے، اور اسے دے کر بڑے شہر روانہ کیا۔ وہ شخص یوں غائب ہوا کہ اس کا کوئی پتہ نہ لگا۔ اور قیمتی موتی ان سے کھو گئیں۔ پھر انہوں نے ایک اور آدمی کو چنا، موتی اس کے حوالے کرکے شہر بھیجا۔ اور وہ بھی یوں غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ پھر اس کے بعد انہوں نے یہ طریقہ چھوڑ دیا اور اپنے طریقے پر چلنے لگے۔"

"میں جانتا ہوں" کینو نے کہا۔ "میں نے اباجان سے یہ سب باتیں سنی تھیں۔ یہ ایک اچھا خیال اور مناسب اقدام تھا، لیکن یہ ہمارے مذہب کے منافی تھا۔ پادری صاحب نے صاف صاف بتادیا کہ ان موتیوں کا کھو جانا ایک سزا تھی ان لوگوں کے لئے جنہوں نے ثابت ہوئے رستہ کو چھوڑنے کی کوشش کی تھی۔ مقدس باپ نے سمجھایا کہ کیسے ہر عورت اور ہر مرد خداوند کا بھیجا ہوا ایک سپاہی ہے جو قصرِ کائنات کے کسی نہ کسی گوشے کی حفاظت کرتا ہے۔ کوئی بیرونی کے لئے پاس پہرہ دینے کے لئے ہے، کوئی بڑی بڑی دیواروں کے گہرے اندھیرے میں اندرونی حصوں کی نگہبانی کر رہا ہے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کو چاہئے کہ اپنا اپنا حصہ سنبھالے اور اپنی جگہ چھوڑ کر ادھر سے ادھر گھومتا نہ پھرے ورنہ اس قصرِ کائنات پر جہنم کے حملوں کا خطرہ رہے گا۔"

"میں نے پادری کی زبانی یہی خطبہ سنا ہے۔" تروان ٹوماس نے کہا۔ "وہ ہر سال یہی خطبہ دیتا ہے۔"

دونوں بھائی ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ انہوں نے اپنی آنکھیں ترچھی کر لیں۔ جیسا کہ وہ اور ان کے باپ، دادا چار سو سال سے کرتے آئے تھے۔ جب سب سے پہلے اجنبی ان کے ملک میں اقتدار لے کر آئے تھے اور بارود کی قوت ان کے اس اقتدار کے پیچھے تھی، اور ان چار سو برسوں میں کینو کے لوگ صرف یہی گر سیکھ پائے تھے۔ آنکھیں ترچھی کرنا، ہونٹ بھینچ لینا اور کنارہ کشی اختیار کر لینا۔ انہوں نے اپنے اپنے حکمرانوں کے درمیان ایک دیوار سی کھڑی کر لی تھی۔ اس دیوار کے اندر رہ کر ہی وہ اپنی وحدت اور یکجائی برقرار رکھ سکتے تھے۔

بڑھتے ہوئے ہجوم کے جلوس پر تقدیس اور سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ کیونکہ سب کو دن اور موقع کی اہمیت کا احساس تھا۔ اگر بچے آپس میں لڑنے جھگڑنے، چیخنے چلانے، ایک دوسرے کی ٹوپیاں کھینچنے اور بال بگاڑنے لگتے تو ان کے بڑے انہیں ڈانٹ کر چپ کرا دیتے۔ یہ دن ان کے لئے اتنا اہم تھا کہ ایک بوڑھا ضعیف بھی اپنے بھتیجے کے مضبوط کندھوں پر سوار چلا آ یا تھا۔ جلوس جھونپڑیوں کے آگے سے گذر کر شہر میں داخل ہوا جہاں کی سڑکیں کشادہ تھیں اور عمارتوں سے لگے ہوئے پکے فٹ پاتھ بنے تھے اور جب وہ گرجا گھر سے گذرے پہلے ہی کی طرح بھک منگے بھی جلوس میں شامل ہو گئے۔ ترکاریاں بیچنے والے ہجوم کو دیکھنے لگے۔ بہت سے سیلون اپنے گاہکوں سے محروم ہو گئے اور دوکاندار بھی اپنی اپنی دکانیں بند کر کے ہجوم کے ساتھ ہو لئے۔ سورج سڑکوں پر اپنی گرمی پھیلاتا رہا۔ سورج کی چمک اتنی تیز تھی کہ چھوٹے چھوٹے پتھر بھی زمین پر سائے پھینک رہے تھے۔

جلوس سے پہلے ہی جلوس کے آنے کی خبر شہر پہنچ چکی تھی۔ اپنے تاریک دفتروں میں موتیوں کے خریدار تیار تاک میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے اپنے کاغذات نکال لئے تاکہ کینو کے سامنے وہ کام میں منہمک نظر آئیں۔ انہوں نے اپنے موتی درازوں میں چھپالئے تاکہ ان ادنیٰ درجے کے موتیوں کا اس شاندار حسین موتی سے مقابلہ نہ ہو۔ وہ کینو کے

موتی کے حسن کے بارے میں سن چکے تھے۔ موتیوں کے سوداگروں کے سبھی دفتر ایک تنگ سی گلی میں ایک ساتھ جمع تھے اور ان کے دریچوں میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور چوبی جھجوں نے روشنی روک لی تھی اور ان دفتروں میں ہمیشہ ایک ہلکا اندھیرا چھایا رہتا تھا۔

ایک موٹا سست سا آدمی اپنے دفتر میں منتظر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک پدرانہ شفقت تھی اور اس کی آنکھیں دوستانہ جذبہ سے چمک رہی تھیں۔ وہ بڑی باقاعدگی سے سب کو سلام کرتا تھا۔ سب کے ساتھ مصافحہ کرتا تھا۔ ایک خوش مزاج آدمی جسے خوب لطیفے یاد تھے مذاق کرتے کرتے وہ بہت جذباتی اور غمگین بھی ہو سکتا تھا۔ چنانچہ آپ کی پھوپھی کے انتقال کا ذکر سن کر اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں اور وہ آپ کے غم میں برابر کا شریک ہو جاتا! آج صبح اس نے اپنی میز پر گلدان میں ایک پھول رکھ چھوڑا تھا، ایک تنہا سرخ پھول۔ اور یہ گلدان اس کے کالے مخملی ٹرے کے ساتھ اس کے سامنے رکھا تھا۔ اس نے بہت صفائی سے داڑھی مونڈ رکھی تھی۔ ہاتھ خوب پاک کیے تھے، اور ناخنوں پر پالش لگایا تھا۔

اس نے آج صبح کے استقبال کے لئے اپنا دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ آج زیر لب کوئی گیت گنگنا رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کا ہاتھ ایک مشق کر رہا تھا۔ ایک سکہ لئے وہ اسے اپنے پوروں پر یوں آگے پیچھے پھسلاتا رہا کہ کبھی سکہ ظاہر ہوتا کبھی غائب ہو جاتا۔ کبھی وہ سکے کو گھما کر چمکاتا۔ سکہ جیسے ایک لمحہ آنکھ جھپکاتے ظاہر ہوتا اور اتنا ہی جلد دوسرے لمحے نظر سے اوجھل ہو جاتا۔ اور وہ اپنا یہ کرتب خود دیکھ نہیں رہا تھا۔ یہ سب کچھ وہ میکانکی طور پر کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پھرتی سے کام کر رہے تھے اور وہ زیر لب کچھ گنگنا رہا تھا اور دروازہ میں سے جھانک رہا تھا۔ اس نے ہجوم کے قدموں کی آواز سنی جو قریب آگیا تھا۔ اس کا ہاتھ زیادہ تیزی سے حرکت کرنے لگا یہاں تک کہ جب کینو کا جسم دروازے میں ظاہر ہوا تو اچانک سکہ چمک کر غائب ہو گیا۔

"صبح بخیر، میرے دوست!" فربہ آدمی نے کہا "میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

کینو نے دفتر کے اندھیارے میں گھور کر دیکھا کیونکہ اس کی آنکھیں باہر سورج کی تاب سے چندھیا گئی تھیں۔ لیکن خریدار کی آنکھیں اب بغیر جھپکے سیدھے، اسے گھور رہی تھیں۔

شکار باز کی آنکھوں کی طرح، بے رحم، تیز آنکھیں لیکن اس کا بقیہ چہرہ بڑی شفقت سے مسکرائے جا رہا تھا اور پوشیدہ طور پر، دراز کے نیچے وہ اب بھی اپنے سکہ کی مشق جاری رکھے ہوئے تھا۔

"میرے پاس ایک موتی ہے۔" کینو نے کہا۔ تو دان ٹوماس اس کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے ایک آواز نکل گئی جب اس نے کینو کو اپنے موتی کے بارے میں اتنا ہلکا بیان دیتے سنا۔ ہمسائے گردنیں اٹھائے دروازے کے اندر جھانکنے لگے۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے دریچے کی سلاخیں پکڑ کر چڑھ گئے اور اندر دیکھنے لگے۔ بہت سے چھوٹے لڑکے نیچے ہاتھ پیر، گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے کینو کی ٹانگوں کے اندر سے دیکھنے لگے۔

"اچھا تمہارے پاس ایک موتی ہے۔" سوداگر نے کہا۔ "کبھی کبھی کوئی شخص درجنوں موتی لے آتا ہے۔ اچھا دیکھیں تمہارا موتی کیسا ہے۔ ہم موتی کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ لگا کر، پوری قیمت تمہیں ادا کر دیں گے۔" اور اس کا دایاں ہاتھ تیزی سے سکہ چلانے لگا۔

کینو کو بھی خود بخود یہ معلوم تھا کہ ڈرامائی اثر کیسے پیدا کیا جائے۔ بڑی آہستگی سے اس نے چرمی بیگ نکالا۔ اس میں سے نرم لیکن میلا ہرن کا چمڑا اور پھر اس نے اپنا شاندار حسین موتی مخمل کے کالے ٹرے میں لڑھکا دیا۔ اور اس لمحہ اس کی نظریں سوداگر کے چہرے پر پہنچیں کہ دیکھیں اس پر کیا فوری اثر ہوتا ہے۔ لیکن سوداگر کے چہرے پر کوئی نشان نہ تھا۔ اس نے کوئی حرکت نہ کی، اس کے چہرے پر کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن وہ ہاتھ جو پوشیدگی میں بیچھے سے مشق کر رہا تھا وہ اپنا کرتب بھول گیا۔ سکہ پوروں سے پھسل کر اس کے زانو پر گر پڑا اور دراز کے نیچے اس کی انگلیاں ایک مٹھی میں بھنچ گئیں۔ دایاں ہاتھ آہستہ آہستہ آہستہ دراز کے پیچھے سے نکل آیا۔ اس کی ایک انگلی نے موتی کو چھوا، اور اسے پھر مخملی سیاہ ٹرے پر لڑھکایا۔ ایک انگلی اور انگوٹھے سے اٹھا کر آنکھوں کے پاس لے گیا پھر اسے ہوا میں گھما کر اچھالا۔

کینو اپنی سانس روکے کھڑا تھا۔ پڑوسیوں نے بھی اپنی سانسیں روک لی تھیں۔ اور سرگوشیوں میں یہ بات پیچھے تک پہنچی۔ "وہ موتی کا معائنہ کر رہا ہے۔ ابھی تک قیمت کا ذکر نہیں ہوا ہے۔ کوئی قیمت چکائی نہیں گئی ہے۔"

اب سوداگر کا ہاتھ ایک شخصیت کا حامل بن گیا تھا۔ اس ہاتھ نے موتی کو پھر ٹرے میں پھینک دیا۔ انگلی چبھو کر اس کی تحقیر کی اور خریدار کے چہرے پر ایک افسوس اور حقارت بھری

مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

"مجھے افسوس ہے میرے دوست" اس نے کہا۔ اور اپنے کندھے اچکائے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اس میں اس کا اپنا کوئی قصور نہیں۔

"موتی بے بہا ہے" کینو نے کہا۔

خریدار کی انگلیوں نے حقارت سے موتی کو پرے ہٹایا۔ موتی اچھل کر مخمل ٹرے کے کنارے پر جا لگا، پھر کنارے سے ٹکرا کر واپس آ گیا۔

"تم نے جھوٹے سونے کے بارے میں سنا ہوگا جس پر اصل سونے کا دھوکہ ہوتا ہے۔ یہ موتی اسی جھوٹے سونے کے مانند ہے۔ یہ سچا موتی نہیں ہے اور اس کا حجم بہت بڑا ہے۔ بھلا اتنا بڑا موتی کون خریدے گا؟ ایسی اشیاء کے لئے کوئی مارکیٹ نہیں ہے۔ یہ تو بس شوقیہ دیکھنے کی چیز ہے۔ تمہارا خیال تھا کہ یہ موتی بہت بیش بہا ہے؟ نہیں یہ تو محض دیکھنے کی چیز ہے۔"

کینو کے چہرے پر تذبذب اور پریشانی کے آثار پیدا ہوئے۔ "یہ دُرِ جہاں ہے۔" وہ چلایا۔ "دنیا میں کسی نے ایسا موتی نہیں دیکھا۔"

"اس کے بالکل برخلاف" خریدار نے کہا۔ "یہ بہت بڑا اور بے ہنگم ہے۔ ایک عجوبہ ہونے کی بنا پر یہ کوئی دلچسپی پیدا کرے تو کرے، ورنہ اس کی کوئی قیمت نہیں۔ شاید کوئی میوزیم اسے خرید لے اور سمندری سیپیوں کے ساتھ اس کی نمائش کرے۔ میں اس کے لئے تمہیں ایک ہزار پیسوس دے سکتا ہوں۔"

کینو کا چہرہ سیاہ اور خوفناک ہو گیا۔ "یہ موتی پچاس ہزار کا ہے۔" اس نے کہا "آپ خوب جانتے ہیں اور آپ مجھے دھوکا دے رہے ہیں۔"

سوداگر نے دیکھا سارے مجمع پر اس کی قیمت کو سن کر ایک بے اطمینانی پھیل گئی ہے اور وہ سب شکایتاً بڑبڑا رہے ہیں۔ سوداگر کے جسم میں خوف سے ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔

"آپ لوگ مجھے الزام نہ دیں۔" اس نے جلدی سے کہا "میں تو صرف جانچنے والا ہوں۔ آپ دوسروں سے پوچھ لیں۔ آپ ان کے دفتروں میں جا کر یہ موتی دکھا لائیں۔ نہیں یہ بہتر ہوگا کہ دوسرے سوداگر یہیں چلے آئیں تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کوئی دھوکا نہیں دیا جا رہا ہے۔ "لڑکے!" اس نے پکارا اور جب اس کے ملازم لڑکے نے پیچھے کے

دروازے سے سر نکالا، سوداگر نے کہا "لڑکے تم فلاں فلاں کے پاس جاؤ اور ان سے کہو ذرا سی دیر کے لئے یہاں چلے آئیں اور یہ نہ بتانا کہ کیوں۔ صرف یہ کہنا کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

اور اس کا سیدھا ہاتھ آہستہ سے دراز کے پیچھے گیا، اپنی جیب سے اس نے ایک اور سکہ نکالا۔ اور اسے اپنی پوروں پر گھمانے لگا۔

کینو کے پڑوسی آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ انہیں خوف تھا کہ ایسی ہی کوئی بات ہوگی۔ موتی بہت بڑا تو تھا لیکن اس کا رنگ واقعی کچھ عجیب سا تھا۔ تو ایک ہزار پیسوس کو یوں پھینک تو نہیں دینا چاہیئے، ایک غریب آدمی کے لئے ایک ہزار پیسوس ایک دولت تھی۔ کینو ایک ہزار پیسوس ہی قبول کرلے تو حرج کیا ہے؟ کل تک تو اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

لیکن کینو تن کر سخت ہو گیا تھا۔ اس نے بدنصیبی کو آہستہ آہستہ اپنے پاس رینگتے محسوس کیا۔ بھیڑیوں کو اپنے گرد دائرہ بناتے دیکھا اور گدھوں کو اپنے گرد منڈلاتے دیکھا۔ اس کے گرد شر کا دباؤ بڑھ رہا تھا اور وہ اپنے آپ کو بے بس پا رہا تھا۔ اپنی حفاظت آپ نہیں کر سکتا تھا۔ اور اس کے کانوں میں شر کی موسیقی گونج رہی تھی۔ اور کالے مخمل پر اس کا عظیم الشان موتی خیرہ کن آب دے رہا تھا۔ حتیٰ کہ سوداگر کی آنکھیں اس پر سے ہٹائے نہ ہٹتی تھیں۔

ہجوم دروازے پر سے ٹوٹ کر رہ گیا تاکہ آنے والے تین سوداگروں کو جگہ دے۔ ہجوم اب بالکل ساکت اور خاموش تھا کہ مبادا ان سے کوئی لفظ چھوٹ نہ جائے اور کوئی اشارہ، چہروں پر کسی جذبہ کا اظہار ان سے چھپا نہ رہے۔ کینو بھی خاموش تاک میں تھا۔ اس نے پیچھے سے ایک جھٹکا محسوس کیا اور مڑ کر جوانا کی آنکھوں میں دیکھا اور جب وہ واپس سامنے مڑا تو اس میں ایک نیا عزم، ایک نئی قوت پیدا ہو چکی تھی۔

خریداروں نے ایک دوسرے کی طرف نہیں دیکھا۔ اور نہ موتی کی طرف۔ دراز کے پیچھے بیٹھے سوداگر نے کہا "میں نے اس موتی پر ایک قیمت لگائی ہے اور موتی کا مالک اسے مناسب قیمت نہیں سمجھتا۔ میں اب آپ سے کہتا ہوں کہ آپ اس موتی کا معائنہ کریں اور اپنی طرف سے اس کی قیمت لگائیں۔" "دیکھنا" اس نے کینو کی طرف مڑ کر کہا "میں نے

انہیں نہیں بتایا ہے کہ میں نے تمہیں کیا پیش کش کی تھی۔"

آنے والے سوداگروں میں سے پہلا سوداگر روکھا روکھا سا تھا۔ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے موتی پر پہلی دفعہ اس کی نظر پڑی ہو۔ اس نے موتی اٹھایا۔ ایک انگلی اور انگوٹھے کے درمیان اسے گھما کر دیکھا اور حقارت سے واپس ٹرے میں پھینک دیا۔

"مجھے اس بحث سے معاف ہی رکھئے۔" اس نے روکھائی سے کہا۔ "میں تو اس موتی کے لئے کوئی پیش کش ہی نہیں کروں گا۔ یہ موتی نہیں، کوئی مہیب عجیب الخلقت شے ہے۔" تحقیر سے اس کے لب مڑ گئے۔

اب دوسرے سوداگر نے، جو شرمیلی نرم آواز والا ایک چھوٹا سا آدمی تھا، موتی کو اپنے ہاتھ میں لیا، اس کا بڑے غور سے معائنہ کیا۔ اس نے اپنی جیب سے مکبر شیشہ نکالا اور موتی کا اس شیشہ سے جائزہ لیا۔ پھر وہ ہلکے سے ہنس پڑا۔

"موم سے اس سے کہیں بہتر موتی بن سکتے ہیں۔ میں ان چیزوں کو خوب جانتا ہوں۔ یہ موتی نرم اور کچ کا سا ہے۔ چند مہینوں میں یہ اپنا رنگ کھو دے گا۔ یہ دیکھو۔" اس نے محدب شیشہ کینو کو دیا اور اس کے استعمال کا طریقہ بتلایا۔ کینو نے کبھی موتی کی سطح کو محدب شیشے سے نہ دیکھا تھا۔ موتی کی سطح کو مکبر دیکھ کر اسے دھکا سا پہنچا۔

تیسرے سوداگر نے موتی کو کینو کے ہاتھوں سے لے لیا۔ "میرا ایک گاہک ایسی چیزیں پسند کرتا ہے۔" اس نے کہا۔ "میں پانچ سو پیسوس تمہیں پیش کرتا ہوں۔ شاید میں اسے اپنے گاہک کو چھ سو میں بیچ سکوں۔"

کینو نے فوراً ہاتھ بڑھا کر موتی اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور ہرن کے چمڑے میں اسے لپیٹ کر اپنی قمیص میں چھپا لیا۔

دراز کے پیچھے کھڑے ہوئے پہلے سوداگر نے کہا۔ "میں جانتا ہوں، میں بے وقوف ہوں لیکن، لیکن میں اب بھی پہلی پیش کش پر قائم ہوں۔ میں اب بھی ایک ہزار پیسوس دینے کے لئے تیار ہوں۔ اور یہ تم کر کیا رہے ہو؟" اس نے کینو کو موتی چھینتے اور چھپاتے دیکھ کر پوچھا۔

"مجھے یہاں دھوکا دیا جا رہا ہے۔" کینو غصہ سے چلّا اٹھا۔ "میرا موتی یہاں

فروخت ہونے کے لئے نہیں ہے۔ میں اسے بڑے شہر کی راجدھانی کو لے جاؤں گا۔"
اب خریدار ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ وہ جانتے تھے کہ اب کہ انہوں نے بہت سختی کی تھی۔ انہیں اس ناکامی پر سرزنش کی جائے گی اور دروازے کے پیچھے والے خریدار نے جلدی سے کہا۔ "میں ایک ہزار پانچ سو تک اس کی قیمت بڑھاتا ہوں۔"

لیکن کینو لوگوں کو ہٹاتا ہوا تیر بہ تیر باہر نکل گیا۔ بہت سے لوگوں کے باتیں کرنے کی آواز اس کے کانوں میں دھیمی پڑ رہی تھی۔ اس کا خون کھول رہا تھا اور یہ ابلتا ہوا خون گویا اس کے کانوں پر ٹکے مار رہا تھا۔ وہ ہجوم کو توڑ کر باہر نکل گیا اور آگے آگے چلنے لگا اور جوانا لڑکھڑاتے قدموں سے اس کے پیچھے ہو لی۔

شام ہوئی اور ہمسائے اپنی اپنی جھونپڑیوں میں بیٹھے، مکئی کی روٹیاں، سیم کے دانوں کے سالن سے کھاتے ہوئے، آج صبح کے بڑے موضوع پر بحث کرنے لگے۔ اصل بات کیا تھی انہیں اس کا علم نہ تھا۔ دیکھنے میں تو موتی نہایت نفیس اور شاندار معلوم ہوتا تھا لیکن انہوں نے ایسا موتی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ موتیوں کے سوداگر موتی کی قدر و قیمت کے بارے میں کہیں بہتر جانتے تھے۔

"اور اس کا خیال رکھنا؟" انہوں نے کہا۔ "ان خریداروں نے آپس میں موتی کے بارے میں بحث نہیں کی۔ اس کے باوجود ان میں سے ہر ایک جانتا تھا کہ اس موتی کی کوئی قیمت نہیں۔"

"لیکن فرض کرو انہوں نے پہلے ہی سے یہ سب کچھ آپس میں طے کر لیا ہو؟"

"اگر یہ بات ہے تو ساری عمر ہم ان سے دھوکا کھاتے رہے ہیں؟" شاید ان میں بعض نے رائے ظاہر کی "شاید یہ بہتر ہوتا اگر کینو ایک ہزار پیسوس قبول کر لیتا۔ ایک ہزار پیسوس تو ایک بڑی رقم ہے۔ اتنی بڑی رقم تو کینو نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔ شاید کینو بے وقوف ہے، خود دماغ ہے۔ فرض کرو وہ واقعی راجدھانی چلا جائے اور وہاں بھی اسے کوئی خریدار نہ ملے؟ اس شکست و ناکامی کے بعد وہ زندہ نہیں رہے گا۔"

"اور اب" چند اور نے اندیشہ ظاہر کیا۔ "اب کے کینو نے ان سوداگروں سے کھلم کھلا سرکشی کی ہے۔ وہ آئندہ کبھی اس سے معاملہ نہ رکھیں گے۔ کینو نے اپنے پاؤں پر

آپ کلہاڑی ماری ہے۔ اپنے آپ کو تباہ کیا ہے۔"

دوسروں نے کہا "کینو دلیر آدمی ہے، دلیر اور جوشیلا۔ وہ اپنی جگہ حق پر ہے۔ اس کی اس ہمت سے شاید ہم سب فیضیاب ہوں۔" یہ لوگ اپنے ہمسائے کینو پر فخر کرتے تھے۔

اپنے گھر میں کینو چٹائی پر بیٹھا کسی سوچ میں غرق تھا۔ اس نے اپنا موتی تنور کے پتھر کے نیچے چھپا دیا تھا اور وہ اپنے سونے کی چٹائی پر بنے ہوئے نقوش کو گھورتا رہا۔ گھورتا رہا یہاں تک کہ یہ نقوش اس کے سر میں ناچنے لگے۔ اس نے ایک جہان کھو دیا تھا اور دوسرا جہان پایا نہ تھا۔ اور کینو خوفزدہ تھا۔ زندگی میں کبھی وہ اپنے گاؤں سے باہر نہ گیا تھا۔ اسے اس اجنبی، مہیب جانور سے ڈر لگتا تھا جسے راجدھانی کہتے ہیں۔ یہ راجدھانی دریا کے اس پار، پہاڑیوں سے پرے ہزاروں میل دور تھی۔ اور ہر اجنبی فاصلے سے کینو کو خوف معلوم ہوتا تھا۔ لیکن کینو اب اپنی پرانی دنیا کھو چکا تھا اور اسے ایک نئی دنیا کی تلاش میں گرتے پڑتے یہ فاصلہ طے کرنا تھا۔ کیونکہ اس کا مستقبل کا خواب سچا تھا، اور اس مستقبل کو وہ مٹانا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے کہا تھا "میں جاؤں گا۔" اور اس کا یہ کہنا بھی ایک حقیقت بن گیا تھا۔ وہاں جانے کا عزم کر لینا بجائے خود آدھی راہ طے کر لینا ہے۔

جوانا اسے دیکھتی رہی۔ جب وہ اپنا موتی زمین میں دفن کر رہا تھا، اپنے بچے کو نہلاتے ہوئے، اسے دودھ پلاتے ہوئے، وہ کینو ہی کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر جوانا نے رات کے کھانے کے لئے مکئی کی روٹیاں پکائیں۔

خوان ٹوماس اندر آیا اور کینو کے پاس بہت دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ کینو نے خود ہی سوال کیا "آخر میں کر کیا سکتا تھا؟ وہ دھوکے باز تھے۔"

خوان ٹوماس نے بڑی سنجیدگی سے سر ہلایا۔ ان دونوں میں وہ بڑا تھا اور کینو اس سے ہدایت لینا چاہتا تھا۔ "یہ جاننا بہت مشکل ہے۔" اس نے کہا "ہم یہ جانتے ہیں کہ پیدائش سے لے کر موت تک ہمیں دھوکا دیا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی ہم جیتے جاتے ہیں۔ آج تم نے نہ صرف موتی کے سوداگروں سے سرکشی کی ہے بلکہ ایک پورے نظام سے

سرکشی کی ہے۔ ایک طرز زندگی کو ترک کیا ہے۔ میں تمہارے لئے ڈرتا ہوں۔"

"بھوک اور فاقہ کے علاوہ مجھے اور کسی چیز کا ڈر نہیں" کینو نے کہا۔ لیکن تردان ٹوماس نے آہستہ سے اپنا سر ہلایا۔ "بھوک اور فاقہ سے تو ہم سب کو ڈرنا نہیں چاہیے لیکن فرض کرو کہ تم حق پر ہو۔ اور تمہارا موتی یقیناً بے بہا ہے، تو کیا تم سمجھتے ہو کہ معاملہ یہیں ختم ہو جائے گا؟"

"کیا مطلب؟"

"میں خود نہیں جانتا" تردان ٹوماس نے کہا۔ "لیکن میں تمہارے لئے ڈرتا ہوں، تم ایک نئی زمین پر چل رہے ہو اور راہ سے ناواقف ہو۔"

"میں جاؤں گا۔ میں ابھی جاؤں گا" کینو نے کہا۔ "ہاں" تردان ٹوماس نے اتفاق کیا۔ "جانا تو تمہیں کسی حالت میں ہے لیکن میں یہ سوچتا ہوں کیا راجدھانی کے بڑے شہر میں بھی یہاں سے مختلف بات ہوگی؟ یہاں کم از کم تمہارا دوست میں ہوں، تمہارا اپنا بھائی۔ وہاں تمہارا کوئی نہیں۔"

"میں کر کیا سکتا ہوں" کینو چلا اٹھا۔ "یہاں کوئی گہری سازش ہے۔ میرے بچے کو موقع ملنا چاہیے۔ وہ میرے بچے کے مستقبل پر حملہ کر رہے ہیں۔ میرے دوست میری حفاظت کریں گے۔"

"تمہارے دوست تمہاری حفاظت اس وقت تک کریں گے جب تک کہ ان پر کچھ بن نہ آئے۔ اور انہیں کسی خطرہ کا سامنا نہ کرنا پڑے۔" تردان ٹوماس نے کہا۔ اور پھر وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا "خدا تمہاری حفاظت کرے۔"

اور کینو نے جواب دیا۔ "خدا تمہارے ساتھ ہو۔" اس نے اوپر دیکھا تک نہیں کیونکہ الفاظ میں ایک عجیب سی جھرجھری لانے والی خنکی تھی۔

تردان ٹوماس کے چلے جانے کے بہت دیر بعد تک وہ خیالوں میں ڈوبا اپنی چٹائی پر بیٹھا رہا۔ اس پر ایک سستی سی چھا رہی تھی۔ ایک بھوری، بے رنگ ہ مایوسی سی، اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کے آگے ہر راستہ بند ہے۔ اس کے سر میں غنیم کی تار یک موسیقی سما رہی تھی۔ اس کی ساری حسیں بیدار ہو گئی تھیں اور جل اٹھی تھیں۔

لیکن اس کا ذہن اپنے ارد گرد کی ساری چیزوں کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ رات کی ہر آواز کو سن سکتا تھا۔ درختوں اور گھونسلوں میں بسیرا کرتے ہوئے پرندوں کی آواز، بلبلوں کی چیخوں کی آواز، ساحل پر موجوں کے ٹکرانے اور واپس لوٹ جانے کی آواز، اور دور فاصلے کی سرسراہٹ۔ وہ دریائی گھاس کی تیز بو سونگھ سکتا تھا جو لہروں کے واپس لوٹ جانے سے باہر آ گئی تھی۔ سوکھی ڈالیوں سے اٹھتا ہوا ننھا سا شعلہ اس کی چٹائی کے نقوش پر ناچ رہا تھا اور اس کی جادو سے بھری آنکھوں کے سامنے یہ نقوش جاگ اٹھے۔

جوانا حیران و پریشان اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ لیکن وہ اس سے خوب واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ خاموش، اس کے قریب رہ کر ہی وہ اس کی سب سے زیادہ مدد کر سکتی تھی۔

اور جیسے وہ خود بھی شر کا گیت سن رہی تھی۔ "گھرانے کا گیت" نرمی سے گا کر وہ اس بدی کے نغمہ کا مقابلہ کرنے لگی۔ اس کے گیت میں گھر کی سلامتی اور نرمی اور یکائی تھی۔ وہ کویوٹیٹو کو اپنے بازوں میں لئے یہ گیت گا رہی تھی تاکہ شر کو اپنے گھر سے دور رکھے۔ اور شر کی تاریک موسیقی کے خطرے کے مقابل میں اس کی آواز دلیر تھی۔

کینو اپنی جگہ سے ہلا نہیں اور نہ اس نے رات کا کھانا مانگا۔ وہ جانتی تھی کہ جب وہ کھانا چاہے گا، مانگ لے گا۔ اس کی آنکھوں پر ایک جادو سا چھایا ہوا تھا۔ وہ محسوس کر سکتا تھا کہ جھونپڑی کے باہر شر کی قوتیں تاک میں ہیں۔ سیاہ چیزیں رینگ رینگ کر آگے بڑھ رہی ہیں اور اس کی تاک میں چھپی بیٹھی ہیں کہ وہ اندھیاری رات میں باہر نکل آئے تو اسے دبوچ لیں۔ باہر اندھیرے میں اسے خوفناک سائے نظر آ رہے تھے۔ رات ڈراؤنی تھی، لیکن یہ رات اسے بلا رہی تھی، اسے دھمکی دے رہی تھی اور مقابلہ کے لئے اکسا رہی تھی۔ اس نے دایاں ہاتھ قمیص کے اندر ڈال کر چاقو کو چھوا، اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ اٹھ کر دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔

جوانا چاہتی تھی کہ اسے روکے۔ اس نے کینو کو روکنے کے لئے ہاتھ اٹھایا اور خوف و ہیبت سے اس کا منہ کھل گیا۔ بہت دیر تک کینو اندھیارے کو چیر کر باہر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے قدم باہر رکھا۔ جوانا نے کسی کے تیزی سے جھپٹنے کی آواز سنی۔ پھر لڑائی

کی آواز اور مارنے کی آواز۔ ایک لمحہ کے لئے وہ خوف سے ٹھٹھر گئی۔ پھر اس کے ہونٹ غصیلی بلی کے ہونٹوں کی طرح اس کے دانتوں پر سے چڑھ گئے۔ اس نے کویوٹیٹو کو زمین پر سلادیا اور چولہے سے ایک بڑا سا پتھر لئے باہر جھپٹی لیکن اس وقت تک سب کچھ ختم ہوچکا تھا۔ کینو زمین پر پڑا تھا اور بڑی مشکل سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے پاس کوئی اور نہ تھا۔ صرف سائے اور بھری ہوئی موجوں کا ٹکراؤ اور فاصلہ کی سرسراہٹ۔ لیکن شیطان کے گرد ہر طرف موجود تھا۔ جھاڑیوں کی باڑ کے پیچھے چھپا بیٹھا تھا۔ گھر کے سائے میں دبکا بیٹھا تھا۔ اُن کے اوپر ہوا میں منڈلا رہا تھا۔

جوانا نے پتھر پھینک دیا اور اپنے ہاتھوں سے کینو کو تھام کر اسے اوپر اٹھنے میں مدد دی اور گھر کے اندر لے آئی۔ کینو کے سر سے خون پھوٹ کر بہ رہا تھا اور اس کے رخسار سے تھوڑی تک ایک گہرا لمبا زخم لگا تھا۔ کینو پر نیم بے ہوشی سی طاری تھی اور وہ اپنا سر اِدھر سے اُدھر ہلا رہا تھا۔ اس کی قمیص پھٹی ہوئی تھی اور کپڑے جسم پر سے کھنچ گئے تھے۔ جوانا نے اسے چٹائی پر بٹھا دیا۔ اس کے چہرے پر تر بتر چمٹے ہوئے گاڑھے خون کو اپنے لہنگے سے پونچھ کر صاف کیا۔ پھر وہ صراحی میں دیسی شراب لے آئی اور کینو کو چند گھونٹ پلائے۔ وہ ابھی تک اپنا سر اِدھر سے اُدھر ہلا رہا تھا اور اپنے آگے چھائے ہوئے اندھیرے کو ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کون تھا وہ؟" جوانا نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا وہ کون تھا۔" کینو نے جواب دیا "میں نہیں دیکھ سکا۔"

جوانا پانی کا گھڑا لے آئی اور کینو کے چہرے کا زخم دھونے لگی۔ کینو چکرایا ہوا، سیدھے اپنے آگے ٹکٹکی باندھے گھورتا رہا۔

"کینو میرے سرتاج" وہ چلائی۔ لیکن کینو کی آنکھیں جوانا کے پار گھورتی رہیں۔

"کینو میری سن رہے ہو؟"

"ہاں سن رہا ہوں۔" اس نے بیزاری سے جواب دیا۔

"کینو یہ موتی ایک شر ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ موتی ہمیں تباہ کر دے، ہم اسے تباہ کر دینگے۔ اسے ہم پتھروں کے درمیان کچل ڈالیں گے۔ سمندر میں اسے

واپس پھینک دیں گے جو اس کی اصل جگہ ہے۔ کینو یہ شہر ہے، یہ شہر ہے؟"

اور جب جوانا نے یہ بات کہی، کینو کی آنکھوں میں روشنی عود کر آئی۔ ان آنکھوں میں غیض کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس کے سارے پٹھے تن کر سخت ہو گئے اور اس کا عزم بھی اتنا ہی سخت اور مضبوط ہو گیا۔

"نہیں" کینو نے کہا۔ "میں اس کا مقابلہ کروں گا اور آخر جیت میری ہی ہو گی۔ ہم اتنا شاندار موقع نہیں کھوئیں گے۔" اس نے چٹائی پر مکے مار کر کہا۔ "کوئی ہم سے ہماری خوش نصیبی نہیں چھینے گا۔" پھر اس کی آنکھوں میں نرمی آ گئی اور اس نے نرمی اور شفقت سے اپنا ہاتھ جوانا کے شانے پر رکھا۔ "مجھ پر یقین رکھو۔" اس نے کہا "میں مرد ہوں۔"

"صبح ہم اپنی کشتی لے جائیں گے۔ ہم سمندر پار کریں گے، پہاڑ طے کریں گے، اور دارالحکومت پہنچ جائیں گے، تم اور میں۔ میں مرد ہوں!"

"کینو!" جوانا نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے ڈر لگتا ہے۔ مرد بھی مارا جا سکتا ہے۔ کینو، آؤ، ہم موتی سمندر میں واپس پھینک دیں۔"

"ہش!" کینو نے سختی سے کہا "میں مرد ہوں۔"

اور جوانا چپ ہو گئی۔ کینو کا ایک لفظ اس کے لئے حکم کے معنی رکھتا تھا۔

"مجھے تھوڑی دیر سو لینے دو" کینو نے کہا۔ "پہلی روشنی پر کل ہم نکل پڑیں گے۔ تم میرے ساتھ آنے سے ڈرتی تو نہیں ہو؟"

"نہیں میرے شوہر!"

کینو کی آنکھوں میں محبت کی نرمی اور گرمی سمٹ آئی۔ اس نے جوانا کے گال کو محبت سے چھوا۔

"تھوڑی دیر سو لیں" اس نے کہا۔

("دُرِّ شہوار" کا ایک باب)

البرٹ کامیو

اجنبی

اجنبی " البرٹ کامیو کے پہلے ناول " The Outsider " کی تلخیص و ترجمہ ہے۔ رفعت نواز نے ناول کی روح اور مرکزی خیال کو کامیابی کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے۔

البرٹ کامیو جسے حال ہی میں نوبل پرائز دیا گیا، فرانسیسی ادب میں فلسفیانہ نقطۂ نظر کی وجہ سے سارتر کی طرح مشہور ہے۔ کامیو کو عام طور پر سارتر کے مکتبۂ فکر سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ خود کامیو اور سارتر کے مباحث اس غلط فہمی کے ازالہ کے لئے کافی ہیں۔

" L'ETRANGER " کامیو کا پہلا ناول ہے جو ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ لیکن آج ۱۵ سال کے بعد بھی کامیو کا مرکزی موضوع وہی ہے جو پہلے تھا یعنی — موت اور آدمی — موت کا خودکشی اور سزائے قتل کی صورتوں میں اسکی تعبیرات کا موضوع بنی ہے۔۔ خودکشی اس کے نزدیک " موجودہ بے مصرف زندگی میں ایک معنویت کی ضرورت کا اظہار ہے " لیکن خودکشی کرنے والے کے مقابلہ میں کامیو اس آدمی کو ترجیح دیتا ہے، جس کی سزائے موت کا حکم صادر ہو چکا ہو۔ کیونکہ ایسا آدمی نسبتاً زیادہ آزاد ہوتا ہے۔

موت کامیو کے ہاں زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ آغاز بن کر آتی ہے — (مذہبی معنوں میں نہیں) موجودہ دور میں زندگی ایک اتفاقی، شعوری عمل کی بجائے ہر قسم کی معنویت سے محروم، ایک مہمل عادت اور مجبوری بن کر جیسے تسمہ پا کی طرح انسان کے کندھوں پر سوار ہے۔ جینے کی امنگ بیزاری اور اکتاہٹ میں

بدل گئی ہے لیکن اس کے باوجود موت کا قرب انسان میں جینے کی ایسی زبردست لگن پیدا کر دیتا ہے کہ آدمی حیات کی اس روشنی کے علاوہ دوسری ہر چیز سے حیرت انگیز طور پر بے نیاز ہو جاتا ہے۔ زندگی کی روشن آگ ہر "ماسوا" کو خس و خاشاک کی طرح جلا دیتی ہے یہاں انسان موت کے سایہ میں خالص زندگی کا تصور اور ادراک حاصل کرتا ہے۔

اسی لئے سارتر نے کہا تھا کہ "کامیو کی قنوطیت آفتابی ہے"۔ یعنی جس طرح آفتاب اندر سے تاریک ہوتے ہوئے بھی روشنی دیتا ہے اس طرح کامیو کی قنوطیت میں بھی امید اور زندگی کی کرنیں پوشیدہ ہیں۔

(دامان) ________________

ماں چل بسی، موت آج ہوئی تھی یا کل اس کا پتہ تار سے نہ چل سکا۔ الجیرس سے پچاس میل دور دھارگو کے ایک آشرم میں تین سال سے قیام پذیر تھی، بس کے ذریعہ میں وہاں رات آنے سے قبل ہی پہنچ سکتا تھا، رات ماں کی لاش کے قریب بیٹھ کر گذارنا پڑتی، دوسرے دن تمام رسومات ختم ہو جاتے، اور شام تک میں لوٹ آتا۔ پھر بھی میں نے دو دن کی رخصت دفتر سے حاصل کر لی تھی۔

سلیستے کے ہوٹل میں میں نے کھانا کھایا، پھر امینیل کے یہاں جاکر اس سے غم کے موقع پر پہنے جانے والی سیاہ ٹائی اور سیاہ پٹی لی، آشرم گاؤں سے میل بھر دور تھا، وہاں پہنچتے ہی دربان مجھے منتظم کے پاس لے گیا۔ وارڈن کی بات چیت سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے اسے مجھ سے شکایت ہے کہ میں نے اپنی ماں کی خاطر خواہ نگہداشت نہیں کی، پھر اس نے خود ہی یہ بھی کہا میں بھی مجبور تھا، مجھے وقت ہی کتنا ملتا ہے۔

ماں کی لاش کو گھر میں پہنچا دیا گیا تھا۔ منتظم مجھے اس کے دروازے تک چھوڑ گیا، وہ خانے کے صندوق میں تابوت بند تھا لیکن پیچ ابھی کسے نہیں گئے تھے۔ دربان پیچ کھولنے کے لئے آگے بڑھا تاکہ میں ماں کا دیدار کر سکوں، لیکن میں نے اسے روک دیا، وہ مجھے عجیب طرح سے گھورنے لگا۔ میں نے سوچا مجھے اسے منع نہیں کرنا چاہئے تھا۔

دربان ایک کرسی کھینچ کر میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا گرمی

تیز تھی اور مجھے نیند آ رہی تھی۔ وقت گذاری کے لیے میں دربان سے گفتگو کرنے لگا۔ پانچ برس سے وہ یہاں تھا، ابتداءً وہ بھی آشرم میں داخل ہوا تھا۔ لیکن دربان کی جگہ خالی ہونے پر اس نے نوکری کر لی تھی۔

اندھیرا بڑھ گیا۔ دربان نے بتیاں جلا دیں اور مجھ سے کھانا کھا لینے کو کہا، لیکن مجھے بھوک نہیں تھی، سو وہ میرے لئے کافی لے آیا۔ کافی پینے کے بعد مجھے سگریٹ پینے کی خواہش ہوئی۔ لاش کے قریب سگریٹ پینا مناسب نہیں خیال کیا جاتا۔ میں نے سوچا اس میں آخر برائی بھی کیا ہے؟ ایک سگریٹ میں نے خود سلگائی اور ایک دربان کو دی، اس نے مجھے بتایا کہ میری ماں کی کچھ سہیلیاں اور کچھ ملاقاتی مرد رات لاش کے قریب بیٹھ کر گذاریں گے۔ ان کے لئے اس نے کرسیاں لگا دی تھیں اور کافی کا انتظام بھی کر لیا تھا۔

ماں کے دوستوں میں عورت مرد کل دس آدمی تھے، مرد دبلے پتلے مریل قسم کے تھے۔ اور عورتیں حد درجہ موٹی اور بد وضع تھیں۔ ان عورتوں کے منہ پوپلے تھے اور آنکھوں کے گرد جھریوں کا جال سا بچھا ہوا تھا۔

ایک عورت رونے لگی، دربان نے بتایا کہ وہ میری ماں کی سہیلی ہے۔ کچھ دیر بعد اس عورت نے رونا بند کر دیا۔ اب میں کافی اکتا گیا تھا اور مجھے تھکن محسوس ہو رہی تھی، سب نے کافی پی، پھر مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی، اور کیا کچھ ہو رہا ہے اس کا ہوش نہ رہا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ ایک دفعہ آنکھ کھلنے پر سب تو سوئے نظر آئے مگر ایک آدمی جاگ رہا تھا، اس نے اپنی ٹھوڑی اپنی چھڑی پر ٹکا رکھی تھی اور مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔

صبح دربان مجھے اپنے کمرہ میں لے گیا۔ میں نے ہاتھ منہ دھو کر کافی پی، سورج آسمان پر چڑھ آیا تھا۔ میں باہر نکلا، آسمان صاف تھا، مٹی کی بھینی بھینی خوشبو بڑی سہانی لگ رہی تھی، مجھے خیال آیا کہ روز اس وقت میں دفتر جانے کی تیاری میں لگا رہتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد آشرم کے منتظم نے مجھے بلایا اور کچھ کاغذات پر میرے دستخط لئے۔ پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا "آپ کو اپنی ماں کا آخری دیدار کرنا ہو تو لاش کا صندوق کھول دیا جائے۔" میں نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے صندوق کو بند کرنے کی اجازت دیدی۔

آشرم میں رہنے والوں میں سے صرف ٹام پیریج کو ماں کی آخری رسومات میں شرکت

کی اجازت دی گئی چونکہ میری ماں سے اس کی گہری دوستی تھی۔

سورج کافی تیز ہو گیا تھا، کچھ دیر چلنے کے بعد ہم پسینے سے شرابور ہو گئے۔ آنکھ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنا بھی دوبھر تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم تار کول کی سڑک پر پہنچ گئے۔ سڑک پر ہمارے پیروں کے نشان بنتے جا رہے تھے۔ آخری رسومات کی کچھ باتیں مجھے یاد ہیں۔ پیرنج کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور جب لاش کو قبر میں اتار دیا گیا تو میں نے بس پکڑ لی اور الجیرس لوٹ آیا۔

اگلے دن سنیچر تھا۔ میری دو دن کی چھٹیوں میں اتوار کا اضافہ ہو گیا تھا۔ داڑھی بنا کر تیرنے کے ارادے سے بندرگاہ کی طرف چل پڑا، سوئمنگ پول پر کافی بھیڑ تھی، وہیں مجھے میری کو ڈینا مل گئی۔ اس نے کچھ دن ہمارے دفتر میں کام کیا تھا۔ تب بھی وہ مجھے بڑی اچھی لگتی تھی اور اب بھی وہ اتنی ہی حسین لگ رہی تھی، بہت دیر تک ہم ساتھ ساتھ تیرتے رہے۔ نہانے کے بعد ہم نے شام میں ساتھ سنیما دیکھنے کا پروگرام بنایا۔

اپنی سیاہ ٹائی کی طرف میری کو متوجہ پا کر میں نے اپنی ماں کی موت کا قصہ سنایا۔ وہ حیران تھی کہ اس سانحے کے موقع پر بھی میں اس طرح پیش آ رہا ہوں۔ میں اس کی حیرانی کا جواب نہ دے سکا۔ لیکن شام تک میری یہ سب کچھ بھول گئی۔ پروگرام کے مطابق ہم نے ساتھ ساتھ سنیما دیکھی، اور اس رات وہ میرے گھر ہی رہ گئی۔

دوسرے دن جب میری آنکھ کھلی، میری جا چکی تھی، اتوار کا دن تھا، اس لئے میں دس بجے تک سوتا رہا، سارا دن سامنے پڑا تھا اور سوائے سونے کے اور کوئی کام نہ تھا۔

دوپہر تک میں بستر ہی میں پڑا رہا۔ باہر جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس لئے کمرے میں ہی انڈے بنا کر ناشتہ سے فارغ ہو گیا۔ ناشتہ کے بعد کچھ دیر کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر الماری سے اٹھا کر ایک پرانا اخبار لے کر بیٹھ گیا۔ اخبار میں کروشن سالٹ کا ایک اشتہار تھا، اسے اخبار سے کاٹ کر اپنے البم میں چپکا دیا۔ اخباروں میں جو چیز مجھے دلچسپ معلوم ہوتی اسے میں اس البم میں چپکا دیا کرتا تھا۔ اس کے بعد ہاتھ دھو کر بالکنی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ یہاں سے قصبے کی شاہراہ نظر آتی تھی۔ سڑک ویران تھی، جو چند ایک لوگ نظر آ رہے تھے وہ بھی بہت جلدی میں معلوم ہو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ایک میاں بیوی اپنے تین بچوں کے

کے ساتھ گذرے۔ پھر کچھ مقامی لوگ ایک گروہ کی شکل میں نمودار ہوئے۔ تیل سے چمکتے ہوئے بال، سرخ نکٹائیاں، ہینگ کر کے کوٹ پہنے ہوئے ٹرام اسٹاپ کی طرف زور زور سے ہنستے اور باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ یہ لوگ شاید قصبے کے بڑے سنیما گھر کو جا رہے تھے۔ ان کے گذر جانے کے بعد سڑک آہستہ آہستہ بالکل خالی ہو گئی۔ اس وقت تک سنیماؤں میں پہلا شو شروع ہو چکا تھا۔ سڑک پر صرف چند دکاندار اور ٹیکسیاں باقی رہ گئی تھیں۔ سڑک کے کنارے لگے انجیر کے درختوں کے اوپر آسمان بالکل صاف تھا۔ سڑک کی دوسری طرف ایک سگریٹ کی دوکان والا برآمدے میں آرام کرسی ڈال کر پیر پھیلا کر بیٹھ گیا تھا۔ ٹرامیں جو کچھ وقت پہلے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں، اب خالی جا رہی تھیں۔ سگریٹ کی دکان کے پاس والے ہوٹل میں ویٹر میزیں صاف کر رہا تھا۔

میں بھی اپنی کرسی گھما کر بیٹھ گیا اور سگریٹ پیتا رہا۔ کچھ دیر بعد آسمان ابر آلود ہو گیا۔ لیکن تھوڑی دیر میں مطلع صاف ہو گیا۔ سڑک پر ویرانی بڑھ گئی تھی۔ میں کافی دیر تک آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔

پانچ بجے کے قریب ٹراموں کی کھڑکھڑاہٹ شروع ہو گئی اور کاریں لمبی قطاروں میں آنے لگیں۔ آسمان کا رنگ بدل رہا تھا۔ گھروں کی چھتوں کے پرے افق پر شفق کی سرخی پھیل رہی تھی۔ شام کے ساتھ سڑک پر بھیڑ زیادہ ہوتی گئی۔ لوگ سنیماؤں اور چہل قدمی سے واپس ہو رہے تھے۔

اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ دفعتاً راستے کے قمقمے جل اٹھے۔ ان کی روشنی میں آسمان پر ستارے اور بھی ماند معلوم ہونے لگے۔ اتنی دیر دیکھتے رہنے کی وجہ سے میری آنکھیں تھکن محسوس کر رہی تھیں۔ قمقموں کے نیچے روشنی کے دائرے نظر آ رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی ٹرام گذرتی تو اس کی روشنی میں کسی لڑکی کے بال یا مسکراہٹ یا نقرئی چوڑیاں چمک اٹھتیں۔

آہستہ آہستہ آمد و رفت کم ہوتی گئی اور تھوڑے سے وقت میں سڑک سنسان ہو گئی۔ درختوں اور روشنی کے کھمبوں کے اوپر آسمان کی سیاہی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نیچے سے کھانے کا کچھ سامان لے آیا۔ اور ہیٹر کے چولھے پر کھانا بنا کر کھڑے ہی

سوغات

رات کے کھانے سے فارغ ہو گیا۔ خنکی بڑھ چلی تھی۔ دریچہ بند کر کے اپنے بستر کی طرف بڑھا تو قدِ آدم آئینے میں میز پر گرے ہوئے روٹی کے ٹکڑوں اور اسپرٹ کے چولہے کی جھلک نظر آئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ایک اور اتوار گذر گیا۔ ماں کی تدفین ہو چکی ہے اور کل سے میں حسبِ معمول کام پر جانے لگ جاؤں گا۔ سچ تو ہے کہ میری زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

اگلے دن دفتر میں بہت کام تھا لیکن مالک کا مزاج اچھا تھا۔ اس نے ماں کے بارے میں باتیں کیں اور ماں کی عمر دریافت کی مجھے عمر معلوم نہیں تھی۔ یہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ مجھے ماں سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ میں نے کبھی اس میں دلچسپی نہیں لی۔ ایک ماں ہی پر منحصر نہیں، سب سے الگ تھلگ رہنا میری فطرت میں داخل ہے شروع ہی سے میں تنہائی پسند آدمی ہوں۔ لیکن جواب تو دینا ہی تھا، اس لئے میں نے اندازاً کہہ دیا کوئی ساٹھ برس ہو گی۔

شام کو گھر پہنچا تو سیڑھیوں پر بوڑھے سیلمنو سے ملاقات ہو گئی۔ ہم دونوں کے فلیٹ ایک ہی منزل پر واقع ہیں۔ اس کا اسپینیل کتا ہمیشہ کی طرح اس کے ساتھ تھا۔ خارش کی وجہ سے کتے کا ایک ایک بال جھڑ گیا تھا اور اس کے سارے جسم پر سرخ سرخ چکتے پڑ گئے تھے۔ کوئی دوا اس کی خارش کا علاج نہ کر سکی تھی۔ آٹھ سال سے روز صبح و شام دونوں گھومنے نکلتے تھے۔ جاتے وقت کتا آگے نکلنے کی کوشش میں پوری طاقت سے سیلمنو کو کھینچتا ہوا بڑھتا۔ یہاں تک کہ بوڑھے کا قدم لڑکھڑا جاتا اور گرتے گرتے سنبھل کر کتے کو مارنے اور گالیاں دینے لگتا۔ اس کے بعد کتا چلنے سے انکار کر دیتا۔ اب کتے کو کھینچتے ہوئے چلنے کی باری بوڑھے کی ہوتی۔ چلتے چلتے کتا اپنی گردن سے بندھی ہوئی ڈور کو جھنجھوڑنے لگتا اور پھر سیلمنو کی گالیاں اور مار۔ جب بھی یہ دونوں باہر نکلتے یہی ہوتا۔ سیلمنو ہمیشہ کتے سے بیزارگی ظاہر کرتا لیکن اسے ایک لمحہ کے لئے اپنے پاس سے الگ ہونے نہیں دیتا۔ اب بھی وہ گالیاں دیتا ہوا کتے کو لئے جا رہا تھا۔ میرے سلام کا بھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اسی وقت ہماری منزل پر رہنے والا ایک اور شخص آ گیا۔ ریمنڈ سینٹے، لوگوں

کی اس سے متعلق کوئی اچھی رائے نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں ریمنڈ عورتوں کا بیوپار کرتا ہے۔ لیکن مجھے لوگوں کے کہنے سے کیا مطلب، کبھی کبھی وہ میرے یہاں آجاتا ہے۔ اس لئے آج جب اس نے مجھے اپنے یہاں مدعو کیا تو میں اس کے یہاں چلا گیا۔ وہ ایک شخص سے لڑکر آیا تھا اور اس معاملہ میں وہ کچھ مشورہ لینا چاہتا تھا۔ جب ہم کھانے بیٹھے تو اس نے سارا معاملہ سمجھایا، اس شخص کی بہن، اس کی داشتہ تھی۔ مکان کا کرایہ اور ماہانہ خرچ وہ اسے دیا کرتا تھا، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ عورت آوارہ ہے۔ دو تین دیگر مردوں سے بھی اس کے ناجائز تعلقات ہیں۔ اس لئے وہ مشتعل ہوگیا تھا۔ اس نے اس عورت کو خوب مارا، پھر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تھا وہ اسے اور کڑی سزا دینا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس عورت کو ایسا خط لکھا جائے جس کو پڑھ کر اسے غصہ بھی آئے اور اپنے کئے پر ندامت بھی ہو۔ پھر وہ سمجھوتہ کرنے ریمنڈ کے گھر آئے، ریمنڈ اس سے محبت کا ناٹک رچائے اور بعد میں دھکے دیکر اسے گھر سے باہر نکال دے، خط کا لہجہ کچھ نرم بھی ہوسکتا تھا۔ لیکن میں کچھ زیادہ پی گیا تھا، میں نے ریمنڈ کی ہاں میں ہاں ملائی اور جیسا وہ چاہتا تھا ویسا ہی خط لکھ دیا۔ اور اسی وجہ سے وہ میرا دوست بن گیا۔

اتوار کی دوپہر کو ریمنڈ کے کمرے میں ایک عورت کی آواز سنائی دی، تھوڑی دیر بعد سیلمنو اور اس کے کتے کا جھگڑا بھی سنائی دیا، میرے ساتھ اس وقت میری بھی تھی۔ میں نے اسے ساری باتیں بتائیں تو وہ ہنس پڑی۔ اچانک مجھ سے میری نے پوچھا کیا میں اسے بے حد پیار کرتا ہوں، میری مجھے اچھی معلوم ہونے لگی تھی۔ لیکن پیار کی بات میں نے کبھی گہرائی میں جاکر سوچا نہیں تھا سو میں نے سچ بات کہدی وہ کچھ اداس ہوگئی۔ لیکن یہ اداسی زیادہ دیر باقی نہیں رہی۔

اسی وقت ریمنڈ کے یہاں سے آپس میں جھگڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ عورت چلا رہی تھی اور ریمنڈ گالیاں بک رہا تھا۔ چیخ پکار سن کر کئی آدمی جمع ہوگئے۔ ایک پولس والا بھی آگیا۔ اس نے عورت کو اس کے گھر روانہ کیا اور ریمنڈ سے کہہ گیا کہ وہ تھانہ آنے کے لئے تیار رہے۔

ایک بجے ہیری چلی گئی۔ ریمنڈ نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے بتایا کہ ساری کارروائی تو اپنے پروگرام کے مطابق ہوئی لیکن آخر میں عورت نے اسے ایک طمانچہ جڑ دیا اور اس طرح معاملہ بگڑ گیا۔ پھر بھی وہ مطمئن تھا کہ اس نے عورت سے بے وفائی کا بدلہ لے لیا ہے۔ اب پولیس جو چاہے کرے۔

شام کو ہم دونوں ساتھ گھومنے نکلے۔ ایک ہوٹل میں اس نے مجھے برانڈی پلائی۔ ہم تھوڑی دیر بلیئرڈس کھیلنے کے بعد گھر پہنچے تو باہر ہی سلمنو ملا۔ وہ بدحواس سا کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ نیا ملازم کتے کو لے کر گھومنے گیا تھا لیکن راستہ میں کتا سر زنجیر سے باہر نکال کر بھاگ گیا۔ ہم نے اسے سمجھایا کہ کتا یا تو لوٹ آئے گا یا پولس پکڑ کر اسے کانجی ہاؤس میں بند کر دیگی۔ لیکن اسے تسلی نہیں ہوئی۔ کچھ دیر بعد پھر وہ میرے پاس آیا۔ دروازے پر کھڑے کھڑے اس نے مجھ سے کانجی ہاؤس کے قوانین پوچھے اور لوٹ گیا۔ اس کے اور میرے کمرے کے بیچ میں صرف ایک دیوار حائل تھی۔ کچھ دیر بعد اس کے رونے کی آواز مجھے سنائی دی۔ وہ اپنے کتے کے لئے رو رہا تھا۔

ریمنڈ نے اگلے دن مجھے دفتر میں مطلع کیا کہ آنے والا اتوار میں اس کے ساتھ اس کے دوست کے یہاں گذاروں۔ لیکن میں ہیری سے ملنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ ریمنڈ نے ہیری کو بھی ساتھ لانے کا مشورہ دیا۔ اس نے اور ایک بات کہی کچھ لوگ اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ ان میں اس کی داشتہ کا بھائی بھی شامل تھا۔

مالک نے مجھے بلایا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ پیرس میں کمپنی کی شاخ کھلنے والی ہے میرا وہاں تبادلہ کر دیا گیا ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہ تھا۔ لیکن مالک کا خیال تھا کہ شاید میں خوشی سے اچھل پڑوں گا۔ کیونکہ مجھے ترقی کا موقع مل رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس کی پرواہ نہ تھی۔ میں نے اس سے کہہ بھی دیا کہ نئی جگہ جانے سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔ شاید یہ بات اسے پسند نہ آئی۔ وہ مجھے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ لیکن میں کیا کر سکتا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں میں بھی خوبصورت خواب دیکھا کرتا تھا لیکن پڑھائی ختم کرتے ہی مجھے ان خوابوں کی حقیقت معلوم ہو گئی۔

شام کو ہیری آئی اور اس نے مجھ سے بیاہ کا ذکر کیا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن

اس نے مجھ سے دوبارہ پیار کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے وہی پرانا جواب دہرایا۔ وہ پوچھ بیٹھی۔ "تب مجھ سے شادی کیوں کرتے ہو؟"

میں نے دل کی بات بتادی۔ میرے لئے شادی کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ لگاؤ نام کی کوئی چیز مجھ میں تھی ہی نہیں۔ شادی سے وہ خوش ہوتی۔ اس لئے میں شادی کرنے کو راضی تھا۔ جیری پہلے تو سوچ میں پڑ گئی، پھر بولی۔ "شاید تمہاری اسی بات پر میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔"

میں نے اسے پیرس جانے کی بات بتائی تو وہ خوش ہوئی کہ اسے پیرس میں رہنے کا موقع ملے گا۔

اتوار کو بستر چھوڑنا بہت کٹھن ہوتا ہے، مجھے جیری نے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ تیرنے کی جلدی تھی اس لئے ناشتہ کئے بغیر ہی ہم چل دیئے۔ ریمنڈ کا دروازہ کھٹکھٹایا اور سڑک پر اس کا انتظار کرنے لگے۔ جیری کے بال کھلے ہوئے تھے۔ سفید پوشاک میں وہ بڑی جاذب لگ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ریمنڈ بھی آگیا۔ وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ ہم بس اسٹاپ کی طرف چلے۔ ریمنڈ نے میری بانہہ پکڑ کر مجھے دکھایا۔ دوسری طرف کچھ مرد کھڑے تھے۔ ان میں ریمنڈ کی داشتہ کا بھائی بھی شامل تھا۔ جیری کچھ سمجھی نہیں۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ ان آدمیوں کا ریمنڈ سے کچھ جھگڑا ہے۔ ان لوگوں نے اس وقت ہمارا پیچھا نہ کیا۔ ریمنڈ کے دوست کا بنگلہ چھوٹا سا تھا۔ اس بنگلہ کا عقبی حصہ چٹان سے لگا ہوا تھا اور مکان کے سامنے ہی سمندر تھا۔ ریمنڈ کے دوست کا نام ہیسن تھا۔ وہ کافی لمبا چوڑا اور کچھ موٹا بھی تھا۔ اس کی بیوی بھی صحت مند اور ہنس مکھ تھی۔ منٹوں میں جیری ہیسن کی بیوی سے گھل مل گئی۔ ریمنڈ اور ہیسن کی بیوی کی خواہش فی الوقت تیرنے کی نہیں تھی۔ اس لئے میں، جیری اور ہیسن سمندر کی طرف چل پڑے۔ جیری تو جاتے ہی تیرنے لگی۔ ہم دونوں تھوڑی دیر ریت پر پڑے رہے۔ پھر پانی میں اتر پڑے۔

ہمارے لوٹتے ہی سب کھانے بیٹھ گئے۔ ہم نے کھانا ختم کیا تو ساڑھے گیارہ بج رہے تھے باتیں کرتے ہوئے ہم تینوں مرد گھومنے نکل گئے۔ سورج ٹھیک سر کے اوپر تھا۔ چٹانیں کافی گرم ہو گئی تھیں۔ ہم کنارے کنارے چلنے لگے۔ پتہ نہیں کیوں مجھے نیند ستا رہی تھی۔ ریمنڈ نے ہیسن سے نہ جانے کیا کہا اور ہم نے دیکھا کہ دو مرد سامنے سے ہماری طرف چلے آرہے تھے۔ ایک اس کی ایک داشتہ کا بھائی، شاید ان لوگوں کو اس کا اندازہ تھا کہ ہم سمندر کے کنارے ہی

جا رہے ہیں۔

ہمارے اور سامنے سے آنے والوں کے درمیان فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ ریت توے کی طرح گرم تھی۔ جب فاصلہ کچھ قدموں کا رہ گیا تب وہ دونوں رُک گئے۔ ریمنڈ ان کی طرف بڑھا وہ ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ میں اور ریمنڈ دونوں تگڑے تھے۔ اس اثنا میں ریمنڈ کے مخالف نے چاقو نکالا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو خبردار کر دیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں چاقو ریمنڈ کے منہ اور شانے پر بیٹھا۔ وہ دونوں بچ کر بھاگ گئے۔ ریمنڈ کی بانہہ سے خون بہہ رہا تھا۔ ہم اسے بنگلہ میں لے گئے اور وہاں سے میسن اسے ڈاکٹر کے یہاں لے گیا۔ تقریباً ڈیڑھ بجے وہ وہاں سے لوٹے۔ کچھ دیر بعد ریمنڈ ہمارے منع کرنے کے باوجود بھی گھومنے نکل گیا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا۔ بڑی گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ بھٹی کی طرح گرم ہوا چل رہی تھی، ریمنڈ یوں قدم اٹھا رہا تھا جیسے اسے کسی متعینہ جگہ پر پہنچنا ہو۔ کنارے پر ہمیں پھر وہ دونوں عرب دکھائی دیئے۔ میں بڑھ کر ریمنڈ کے ساتھ ہو گیا۔ ہمیں آتا دیکھ کر ان لوگوں نے کوئی حرکت نہ کی۔ ریمنڈ نے ایک ہاتھ اپنی پستول والی جیب میں ڈال لیا۔ لیکن پستول اس سے میں نے لے لی۔ ایکایک وہ دونوں عرب جانب کی سمت تیزی سے سرک کر چٹانوں کے پیچھے چھپ گئے اور ہم بنگلہ کو لوٹ آئے۔ ریمنڈ تو خیر سیڑھیوں سے اوپر چڑھ گیا لیکن میرا سر پھٹا جا رہا تھا اور سیڑھیاں چڑھنا میرے لئے دوبھر ہو گیا تھا۔ اس لئے میں وہیں سے واپس ہو گیا۔

کنارے پر اب بھی گرمی بہت تیز تھی۔ پھر میں چلتا گیا اور چٹانوں تک پہنچ گیا۔ اس صورت کا بھائی مجھے وہاں اکیلا ہی دکھائی دیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے پڑے پڑے ہی سر اوپر اٹھایا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میں نے بھی اپنی پستول مضبوطی سے تھام لی۔ وہ شخص ہلا تک نہیں۔ ابھی ہمارے درمیان کچھ فاصلہ تھا۔ میں ٹھہر گیا۔ میرا سر گرمی سے پھٹا جا رہا تھا۔ میں پھر آگے بڑھا۔ اس شخص نے چاقو نکال لیا۔ چاقو دھوپ میں چمک اٹھا۔ میرے ماتھے سے پسینہ بہہ کر میری آنکھوں میں اتر رہا تھا۔ میری پستول کی پکڑ اور بھی مضبوط ہو گئی اور اس کا گھوڑا اچانک ہی دب گیا۔ سمندر کے کنارے کی ساری خاموشی اور سناٹا ختم ہو گیا۔ میں نے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور اپنی آنکھوں کو صاف کیا اور ایک ایک کر کے مزید چار گولیاں اس شخص کے تڑپتے جسم میں داغ دیں۔ گولی کی ہر آواز مجھے بربادی کی طرف کھینچے لئے جا رہی تھی۔

گرفتاری کے بعد کئی بار مجھ سے پوچھ گچھ کی گئی۔ اور ایک ہفتہ بعد مجھے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ میں نے کوئی وکیل مقرر کرنے کا خیال بھی نہ کیا تھا کیونکہ میری اپنی رائے میں معاملہ بالکل صاف سیدھا تھا لیکن عدالت نے سرکار کی جانب سے میرے لئے وکیل مقرر کر دیا۔

دوسرے دن ایک وکیل میری کوٹھری میں آیا۔ اس کا خیال تھا کہ مقدمہ کافی پیچیدہ ہے۔ اس نے بتایا کہ پولیس نے میرے بارے میں جانچ پڑتال کی ہے جس سے اسے پتہ لگا کہ حال ہی میں میری ماں کا انتقال ایک آشرم میں ہوا ہے اور اس کی آخری رسومات ادا کرتے وقت میں نے بہت بے رحمی اور سنگدلی کا مظاہرہ کیا۔ وکیل اس بارے میں ہر بات کی باریکی سمجھنا چاہتا تھا تاکہ میں عدالت میں اپنے بچاؤ میں کچھ کہہ سکوں۔

وکیل نے پوچھا "تمہیں اپنی ماں کی موت کا صدمہ نہیں ہوا؟" مجھے یہ سوال کچھ عجیب لگا۔ میں شاید ذاتی طور پر کسی سے ایسا سوال نہیں کر سکتا۔ بہرحال میں نے کہا "گذشتہ چند ایک برسوں میں میری عادت کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ میں گذرے ہوئے جذبات اور احساسات کو یاد نہیں رکھ سکتا۔ اب میں یہ تو ٹھیک طور پر بتا نہیں سکتا کہ اس وقت میرے جذبات کیا تھے لیکن مجھے اپنی ماں سے لگاؤ ضرور تھا۔ گو ایسی کوئی شدید محبت نہیں تھی۔" اور پھر میں نے کچھ وقفہ کے بعد کہا "تقریباً تمام آدمی اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی اپنے پیاروں کی موت کی خواہش کرتے ہیں۔" وکیل نے مجھے سمجھایا کہ یہ بات مجھے عدالت میں نہیں کہنی چاہئے۔ میں نے اسے مطمئن کرنے کے لئے حامی بھری لیکن اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ مجھے خود پتہ نہیں میری جسمانی حالت کب اور کس طرح میرے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اب مثال کے طور پر ماں کی تدفین کے دن میں اتنا تھکا ہوا تھا کہ مجھ پر نیم غنودگی طاری تھی اور میں اردگرد کی کسی چیز کا جائزہ نہیں لے سکتا تھا۔ بہرحال کچھ بھی ہو میں یقیناً ماں کی موت کا خواہشمند نہیں تھا۔

وکیل کچھ زیادہ خوش نہیں نظر آ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔" اچھا کیا تم عدالت میں کہو گے کہ تم نے ماں کی تدفین کے وقت اپنے جذبات پر قابو رکھنے کی کوشش کی تھی؟" "نہیں" میں نے کہا "یہ غلط بات ہو گی۔"

وکیل نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے اسے مجھ سے کراہت پیدا ہو رہی ہو۔ تھوڑی دیر

دیر بعد وہ بیزارگی کے عالم میں واپس ہوگیا۔ اگر وہ کچھ دیر اور بیٹھتا تو میں اسے سمجھاتا کہ مجھے اس کی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس کے اعصاب پر مسلط ہوگیا تھا۔ وہ مجھے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اس لئے اس کی جھنجھلاہٹ اور بڑھ رہی تھی۔ میں نے سوچا اسے سمجھاؤں کہیں میں بھی دوسروں کی طرح ایک عام آدمی ہوں لیکن اس سے کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ اس لئے میں خاموش ہوگیا۔ شاید اس میں میرے تساہل کا بھی دخل تھا۔

دوپہر میں دو بجے پھر مجھے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ وکیل کسی وجہ سے نہ آسکا۔ مجسٹریٹ نے بڑی نرمی سے کہا کہ اگر میں چاہوں تو وکیل کے آنے تک جوابات نہ دوں۔ میں نے کہا میں خود جوابات دے سکتا ہوں۔ اس کے بعد باقاعدہ سوال و جواب شروع ہوئے۔ مجسٹریٹ نے پوچھا کہ لوگ مجھے بہت خاموش اور مغرور کیوں سمجھتے ہیں؟" میں نے کہا "میرے پاس بہت کم کہنے کے قابل باتیں ہوتی ہیں، اس لئے میں خاموش رہنا بہتر سمجھتا ہوں۔"

مجسٹریٹ نے مسکرا کر میری تائید کی اور پھر پوچھا "کیا تمہیں اپنی ماں سے محبت تھی؟" میں نے کہا ہاں جس طرح ہر شخص کو اپنی ماں سے ہوتی ہے۔" پھر یکایک وہ پوچھ بیٹھا "تم نے اس شخص کو لگاتار پانچ گولیاں کیوں ماریں۔ میں نے ذرا سوچا اور کہا "لگاتار نہیں پہلے ایک گولی ماری۔ پھر کچھ ٹھہر کر باقی چار۔"

"تو تم ٹھہرے کیوں" جیسے یہ کوئی بڑی اہم بات تھی۔

سمندر کے کنارے کی وہ گھٹن اور گرمی میں نے پھر ایک بار محسوس کی۔ میں چپ رہا۔ میرے پاس کوئی جواب تھا بھی نہیں۔ وہ تین بار سوال دہرانے کے بعد مجسٹریٹ ایکا ایک اپنی کرسی سے اٹھا اور ایک الماری سے چاندی کی صلیب نکالی۔ مجھے صلیب دکھاتے ہوئے اس نے پوچھا "جانتے ہو یہ کیا ہے۔" میں نے گردن ہلا کر کہا "ہاں اچھی طرح۔"

تب اس نے ایک اچھا خاصا طویل لیکچر دے دیا کہ "خدا بڑے سے بڑے گناہ گار کو معاف کر دیتا ہے لیکن اس وقت جب گنہگار خلوص دل سے، ایمانداری سے، اپنے کئے پر پچھتاتا ہے"..... وہ نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ اس کی باتیں کوشش کے باوجود بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ مجھے یوں لگا کہ وہ جاننا چاہتا ہے کہ پہلی گولی چلانے کے

بعد میں رکا کیوں؟ میں کہنا چاہتا تھا کہ یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ لیکن ایکاایک اس نے پوچھا "تمہیں خدا پر یقین ہے؟" میں نے صاف کہہ دیا "نہیں" وہ دھم سے کرسی پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا "یہ تو تصور سے بھی پرے ہے۔ یہ یقین ہی تو زندگی کو کامیاب بناتا ہے"۔

مجسٹریٹ نے آخری سوال کیا "کیا تمہیں اپنے کئے پر افسوس ہے؟" میں نے جواب دیا کہ "میں اسے افسوس تو نہیں کہہ سکتا۔ لیکن مجھے اس وجہ سے پریشانی ضرور ہے"۔ پیشی ختم ہو گئی۔

اور بھی کئی پیشیاں ہوئیں۔ ان میں میرا وکیل برابر حاضر رہتا۔ ہر بار مجھ سے میرے پچھلے بیانات دہرائے جاتے۔ وقت گذرنے کے ساتھ مجسٹریٹ کی دلچسپی مجھ میں کم ہو گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرے معاملہ میں کسی فیصلہ پر پہنچ گیا ہے۔ اس نے پھر کبھی نہ خدا کا نام لیا نہ مذہب کی باتیں کیں۔ سوالات کی گھمبیرتا بھی کم ہو گئی۔ اسی طرح گیارہ مہینے بیت گئے۔

اپنی گرفتاری کے دن میں کئی قیدیوں کے ساتھ ایک بڑے کمرہ میں رکھا گیا تھا اور دوسرے دن سے الگ کوٹھری میں جس کی دیوار میں ایک لکڑی کا تختہ سونے کے لئے لگا تھا، زنجیر کے طور پر ایک اسٹول رکھا تھا اور منہ ہاتھ دھونے کے لئے ایک سلفچی۔ کوٹھری میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جس کے پار سمندر تھا۔ ایک دن میں اسی کھڑکی سے سمندر کی طرف دیکھ رہا تھا کہ وارڈن نے آکر خبر دی کہ کوئی عورت مجھ سے ملنے آئی ہے۔

میری سے میری بات چیت ہوئی۔ اور بھی کئی قیدیوں سے ملنے والے آئے تھے۔ اس لئے بہت شور و غل مچا ہوا تھا۔ میری نے مجھے بتایا کہ بڑی مشکل سے اسے یہاں آنے کی اجازت ملی تھی۔ ریمنڈ نے میرے لئے نیک تمنائیں بھیجی تھیں۔ میری سے مل کر ایکاایک مجھے خواہش ہوئی کہ اسے اپنی آغوش میں لے لوں اور اسے چوموں۔ تب مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں اس سے پیار کرتا ہوں۔ میں اس وقت اپنی خواہش کو دبا گیا (اور اس خواہش کی تکمیل ناممکن بھی تھی)، میری نے مجھے تسلی دی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر ہم شادی کریں گے۔ مجھے گھبرانا نہیں چاہئے۔

ایک ایک کرکے لوگ لوٹنے لگے۔ شور و غل کچھ کم ہوا۔ میری بھی باری آئی اور میری

محبت بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی ہوئی جانے لگی۔ میں جاتے جاتے گھوم کر اسے دیکھتا رہا، وہ مسکرا دی۔

جلد ہی مجھے اس کا خط بھی ملا۔ اس خط سے میری پریشانیاں اور بھی بڑھ گئیں۔ پھر بھی میں دوسرے قیدیوں کی طرح دکھی نہیں تھا۔ البتہ ابتدائی دنوں میں ایک بات مجھے ضرور دکھ دیتی تھی، مجھے خیال ہی نہ رہتا کہ میں قیدی ہوں۔ میرا دل سمندر کے کنارے جانے کو مچل اٹھتا اور کوٹھری کی بلند دیواریں مجھے غمگین کر دیتیں۔ کچھ دنوں میں یہ خیال بھی دور ہو گیا، اور میں آزادی کی باتیں جیسے بھول سا گیا۔ اب میں بھی اس وقت کا انتظار کرتا جب سب قیدیوں کو میدان میں گھومنے لے جاتے تھے۔ اگر میں آزاد ہوتا تو ہر اتوار کو اسی طرح میری سے ملنے جاتا۔ مجھے اپنی ماں کا یہ قول بار بار یاد آتا کہ "آدمی اپنے آپ کو آخرکار ہر حالت کے قابل بنا لیتا ہے اور ہر ماحول میں ڈھل سکتا ہے"۔ اب سب سے بڑا مسئلہ وقت گذاری کا تھا۔ کچھ دنوں بعد مجھے بیتی باتیں اور چیزیں یاد کرنے کی ترکیب سمجھ میں آ گئی۔ میں اپنی خوابگاہ میں تصور کی آنکھوں سے دیکھنے لگتا تو ایک ایک چیز کو دیکھتے ہوئے گھنٹوں گذار دیتا۔ کتنی ہی چیزیں ایسی نظر آ جاتیں جن کی اب یاد بھی نہیں رہی تھی۔

میں نے خیال کیا کہ ایک دن آزاد رہ کر آدمی اس ایک دن کی آزادی کی یاد میں پورے سو سال قید میں گذار سکتا ہے۔ پھر نیند کی بات تھی۔ پہلے تو رات میں بھی نیند اچھی طرح نہیں آتی تھی۔ دھیرے دھیرے رات تو کیا دن میں بھی گہری نیند آنے لگی۔ قید کے آخری دنوں میں تو میں اٹھارہ گھنٹے سویا کرتا تھا۔

میں گرمیوں میں گرفتار ہوا تھا اور دوسری گرمیاں آ گئی تھیں۔ جس دن میرا مقدمہ شروع ہوا دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ صبح ساڑھے سات بجے جیل کی گاڑی مجھے عدالت لے گئی۔ میں نے کبھی کسی مقدمے کی کارروائی نہیں دیکھی تھی۔ اس لئے مجھے اپنے مقدمہ کے شروع ہونے کا بے چینی سے انتظار تھا۔ جیوری میرے چہرے پر مجرمانہ تاثرات ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد میرا وکیل بھی آ گیا اور اخباری نمائندے سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔ پھر وہ میرے پاس آیا اور کہا کہ جو سوال کیا جائے میں اسی کا جواب دوں اپنی طرف سے کچھ شامل نہ کروں۔ پھر سرکاری وکیل آیا۔ اس کے بعد تین جج آئے۔ دو کالے چغے پہنے ہوئے تھے اور تیسرے کا

چہرہ سرخ تھا۔

کارروائی کا آغاز ہوا۔ منصفوں نے وکیلوں سے کچھ قانونی سوالات کئے۔ پھر گواہوں کے نام پکارے گئے، اور کئی جانے پہچانے چہرے عدالت میں نظر آنے لگے۔ ریمنڈ، میسن، سیلیٹی، آشرم کا دربان، پیرج، میری — میری نے عدالت سے باہر پاس والے کمرے میں جاتے ہوئے میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ بڑی عجیب بات تھی کہ ان میں سے کوئی شخص بھی مجھے پہلے نظر نہیں آیا تھا۔ گواہوں میں آخری نام سیلیسٹے کا تھا۔

پھر جج نے مجھ سے سوالات کرنے شروع کر دیئے۔ وہی پرانے سوالات: نام، پتہ وغیرہ وغیرہ۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ مقدمہ کسی اور پر نہ چل جائے۔ اس کے بعد منصف نے کہا کہ "اب میں کچھ ایسی باتیں پوچھوں گا جن کا براہ راست تعلق تو اس واقعہ سے نہیں ہے۔ لیکن یہ باتیں تمہارے کردار پر روشنی ڈالتی ہیں۔" میں سمجھ گیا کہ میری ماں کی موت کے متعلق پوچھا جائے گا۔ وہی ہوا بھی۔ پہلا سوال تھا: "تم نے ماں کو آشرم میں کیوں رکھا تھا؟" میں نے بتا دیا: "پیسوں کی کمی کی بنا پر۔" پھر اس نے پوچھا "تمہیں اس سے دکھ نہیں ہوا؟" میں نے جواب دیا "ہمیں ایک دوسرے سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔" پھر سرکاری وکیل نے جرح شروع کی۔ اس کا پہلا سوال تھا "کیا تم آخری بار سمندر کے کنارے، اس شخص کے قتل کے خیال سے گئے تھے؟" میں نے جواب دیا "نہیں۔" اس نے پوچھا پھر میں پستول ساتھ کیوں لے گیا تھا اور اس جگہ کیوں پہنچا؟ میں نے کہا "یوں ہی۔" وکیل نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا اور صرف اتنا کہا "بہت خوب!"

اس کے بعد عدالت سہ پہر تک کے لئے ملتوی ہو گئی۔ مجھے جیل لے جا کر کھانا کھلایا گیا۔ اور کچھ ہی دیر بعد عدالت پہنچا دیا گیا۔ اب گرمی اور تیز ہو گئی تھی۔

تیسرے پہر پہلے منتظم کا بیان لیا گیا۔ اس نے کہا "میری ماں مجھ سے اس لئے ناراض تھی کہ میں نے اسے آشرم میں شریک کرا دیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ میں نے اپنی ماں کے آخری دیدار سے بھی انکار کر دیا تھا اور اس کی موت پر میں نے ایک آنسو بھی نہیں بہایا اور یہ بھی کہ مجھے اپنی ماں کی عمر تک یاد نہیں۔

سرکاری وکیل نے میری طرف یوں دیکھا جیسے اس نے کوئی لڑائی جیت لی ہو اور مجھے خواہش ہوئی کہ میں گلا پھاڑ کر رو پڑوں۔ اس لمحہ میں نے پہلے پہل جانا کہ سب لوگ مجھ سے نفرت کرتے

ہیں۔ پھر دربان کا بیان ہوا۔ اس نے کہا کہ ماں کی لاش کے قریب بیٹھ کر میں نے کافی اور سگریٹ پی تھی۔ عدالت میں جیسے غصہ کی لہر سی دوڑ گئی۔ میرے وکیل نے دربان سے پوچھا "کیا تم نے سگریٹ نہیں پی تھی؟" اس نے کہا "پی تو تھی لیکن دینے پر۔"

سلیستے نے گواہی میں کہا کہ میں جھوٹ نہیں بولتا ہوں۔ میں اس کا بل وقت پر ادا کرتا ہوں اور جو انہونی واقعہ رونما ہوا ہے وہ اتفاقی واردات ہے۔ وہ اور بھی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی گواہی ختم کر دی گئی۔ وہ حیران رہ گیا۔ جاتے جاتے اس نے مجھے دیکھا۔ یوں جیسے وہ کہہ رہا ہو "مجھ سے جو کچھ ہو سکتا تھا میں نے کیا۔" اور زندگی میں پہلی بار مجھے ایک مرد کا منہ چوم لینے کی خواہش ہوئی۔

پھر میری کی طلبی ہوئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح خوبصورت لگ رہی تھی۔ لیکن وہ کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔ ہمارے تعلقات، شادی، ساتھ تیرنے اور اس قتل کے واقعہ کی روداد سب باتیں اس سے کہلوائی گئیں۔ میری رو پڑی اور میری طرف سے صفائی دینے لگی لیکن وہاں اس کی سنتا ہی کون تھا۔

اگلی گواہی میسن کی تھی۔ اس نے بھی میری تعریف کی۔ لیکن اس کی بات سنی بھی نہیں گئی۔ سیلمنو کے بیان پر بھی کسی نے دھیان نہیں دیا۔ وہ بیچارا یہ سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ میں نے اپنی ماں کو مجبور ہو کر آشرم بھیج دیا تھا۔ آخر میں ریمنڈ گواہی دینے آیا۔ اس نے اپنا اور اپنی داشتہ کا سارا قصہ صاف صاف بیان کر دیا۔ لیکن سرکاری وکیل کا خیال تھا کہ میں شروع سے آخر تک معاملہ میں شامل تھا۔ خط میں نے لکھا، سمندر کے کنارے مقتول اور ریمنڈ کے جھگڑے کے وقت موجود تھا۔ پولیس میں ریمنڈ کی گواہی میں نے دی اور ہم دونوں گہرے دوست ہیں۔ ماں کی موت کے دوسرے ہی دن میں نے انتہائی شرمناک حرکتیں کی تھیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ میں کتنا خراب اور سماج دشمن انسان ہوں۔ میرا وکیل کوئی جواب نہ دے سکا۔ پورا مقدمہ میرے خلاف ہو گیا تھا۔ عدالت برخاست ہوئی اور مجھے جیل پہنچا دیا گیا۔ لوگوں نے میرے متعلق کیا کہا یہ حقیقت میں ایک دلچسپ داستان ہے۔ سرکاری وکیل اور میرے وکیل کی رائے میں کوئی زیادہ تضاد نہیں تھا۔ دونوں ہی مجھے مجرم گردانتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ سرکاری وکیل کا خیال تھا کہ میں جان بوجھ کر یہ قتل کیا ہے۔ اور

میرا وکیل کہتا تھا کہ یہ اتفاقاً ہو گیا ہے۔

ایک بات مجھے بری طرح کھٹک رہی تھی۔ میرے بارے میں اتنے سارے لوگوں نے کہا لیکن مجھے اپنے متعلق کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ جیسے سب مجھے اس کارروائی سے الگ رکھنے کا متفقہ فیصلہ کر چکے تھے۔ کئی بار میری خواہش ہوئی کہ چلّا کر کہوں "آخر یہ میرا مقدمہ ہے اور مجھے بھی کچھ کہنا ہے۔" لیکن خاموش رہا۔

میں لوگوں کو بہت نرمی سے سمجھانا چاہتا تھا کہ میں کبھی اپنے بُرے کام پر نہیں پچھتایا۔ میں تو ہر حال میں دو دبا رہتا ہوں۔ ماضی کا خیال بھی نہیں کرتا۔ جو کچھ ہوا برا ہی ہوا لیکن میں مجبور تھا۔ میں نے کہا مجھے ایک موقع دیا جائے تاکہ میں اپنے کئے پر غور کر سکوں۔ لیکن کسی نے مجھے سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ سرکاری وکیل کے خیال میں میں بدی کا اوتار تھا۔ خیر اور نیکی کا سایہ بھی مجھ پر نہیں پڑا تھا۔ میری حیثیت سماج کے جسم پر کوڑھ کی سی تھی۔ اور میں سماج کے لئے ایک خطرناک فرد تھا۔ میرے لئے کڑی سے کڑی سزا تجویز کی جائے یہ کہہ کر اس نے اپنی بحث ختم کی۔

دوسرے دن میرے وکیل نے جرح شروع کی لیکن اس کی دلیلیں بودی اور کمزور تھیں۔ اس نے کہا کہ میں نے ماں کے تئیں اپنے فرائض برابر انجام دئے۔ اور پتہ نہیں وہ کیا کیا کہتا رہا۔ لیکن میرے ذہن پر ایک دھند سی چھا رہی تھی۔ مجھے ہر چیز مبہم اور دھندلی نظر آ رہی تھی۔

آخر میں ایک حرف ایک چیز میرے ذہن میں محفوظ رہ گئی۔ عدالت کے باہر آئس کریم بیچنے والے کی آواز! اور اس کے ساتھ ہی دل و دماغ میں یادوں کا ایک ہجوم ابھر آیا۔ یادیں ایک ایسی زندگی کی یادیں جو اب مجھ سے رشتہ توڑ چکی تھی۔ اس زندگی نے مجھے معمولی مگر یقینی مسرتیں بخشی تھیں۔ موسم گرما کی حیات بخش خوشبو، میری محبوب گلیاں، شام کے وقت آسمان کے بدلتے ہوئے رنگ، میری کا لباس اور اس کے قہقہے!!

عدالت کی ساری کارروائی کے بے معنی اور بے نتیجہ ہونے کا شدید احساس میرا دم گھونٹ رہا تھا۔ مجھے متلی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے دل میں شدید خواہش ہو رہی تھی کہ جلد از جلد ان مرحلوں سے گذر کر قید خانے واپس ہو جاؤں اور سو جاؤں، سوتا رہوں۔

(بقیہ صفحہ پر)

شاذ تمکنت

○

آہ دیکھی ہے اثر جانا ہے
آج آئینہ سے ڈر جانا ہے

اس حیا بخت کو کھلنا ہے ضرور
زلف کوتا بہ کمر جانا ہے

زندگانی کا سلیقہ مت پوچھ
ہم نے دیوار کو در جانا ہے

آبلہ پائی کی یہ رسم عجیب
ایک اک گام پہ مُڑ جانا ہے

یہ بھی دن تھا مری قسمت میں کہ آج
اپنی الفت سے مکر جانا ہے

شہر سے قصدِ سفر ہے اپنا
تم پکارو تو ٹھہر جانا ہے

سانس لیں زخم کا ٹانکا نہ کھلے
ہم نے بس اتنا ہنر جانا ہے

شفیق فاطمہ شعریٰ

O

رقص خوشبوؤں کے ہیں، راگ رنگ نم کے ہیں
وادیوں میں ہنگامے بادِ صبحدم کے ہیں
دُھند ابر روشن کی لے رہی ہے ہلکورے
آسماں کی آنکھوں میں خواب جامِ جم کے ہیں
اے ربابِ خاموشی ہم سے پردہ داری کیا!
رازداں پُراتے ہم تیرے زیر و بم کے ہیں
داغ بن کے کہہ دو اب اک طرف سمٹ جائیں
یہ جو دل پہ کچھ سایے فکرِ بیش و کم کے ہیں
ہر جنم کی شب سوزِ انتظار میں گذری
اس جنم کے دامن میں اشک ہر جنم کے ہیں
پھر ہمارے اشکوں پہ دیر تک رہی تکرار
ہم کہیں خوشی کے ہیں وہ کہیں الم کے ہیں
ہم تمہارے گلشن میں نغمۂ بہاراں ہیں
نغمۂ ہزاراں ہیں، اور کوئی دم کے ہیں
مژدہ لے کے آیا ہے کوئی اپنے خوابوں میں
اک نئی چمک کے ساتھ مہر و ماہ چمکے ہیں

گوپال متل

(۱)

○

تیری آنکھوں میں جو نشّہ ہے پذیرائی کا
رنگ بھر دے نہ مری زیست میں رسوائی کا

تجھ کو افسونِ محبّت کی ضرورت کیا تھی
سحر کچھ کم تو نہیں تھا تری رعنائی کا

دل تو کیا چیز ہے جاں اس پہ تصدّق کر دوں
یہ اگر عربدہ بھی ہو کسی ہرجائی کا

سوچتا ہوں دلِ بیتاب پہ کیا گذرے گی
سامنا ہو گیا گر پھر شبِ تنہائی کا

شہاب جعفری

یہ شب گراں ہے تو کل صبحِ انقلاب بھی ہے
زمیں کا دور ہے گردش میں آفتاب بھی ہے

مجھی کو ہیچ و رسوا سمجھ کے ساتھ نہ چھوڑ
غمِ حیات کی زد میں ترا شباب بھی ہے

اب اہلِ درد سے افتادِ غم کو راز نہ رکھ
یہ رازِ غم کی امانت سہی، عذاب بھی ہے

ترے ستم تو ستم تھے، ترے کرم بھی سہے
نگاہِ رحم خدارا کوئی حساب بھی ہے

یہ کس جہاں کے ہیں ہم تم کہ مل نہیں سکتے
اسی جہاں میں زمیں بھی ہے آفتاب بھی ہے

جو دل کی پوچھو تو باغ و بہار ہے دنیا
میں کیا کروں کہ برنگِ دلِ خراب بھی ہے

کہو کچھ اہلِ ہوس کار و بارِ دل کی کہو،
کوئی حریمِ محبت میں باریاب بھی ہے

فغاں کہ اہلِ نظر ڈھونڈنے چلے ہیں جسے
وہ حسن پردہ نشیں خانماں خراب بھی ہے

یہی نگاہ جو بچتی رہی تغافل میں
یہی نگاہ تعلق میں بے حجاب بھی ہے

میں تیرے عزم کے قرباں تو یہ گماں نہ ہو
یہ عہدِ غم ہے تو سرکش ترا شباب بھی ہے

(۲)

حسن کو آہ کا پابندِ اثر جانا تھا
آہ خود کو نہ کبھی دستِ نگر جانا تھا

عجز کی پستیٔ فطرت سے ابھر جانا تھا
عشق کو وعدہ و پیماں سے گذر جانا تھا

درد کو درد نہ جانا یہ تقاضائے حیا
پردہ پوشی سے ترا لطفِ نظر جانا تھا

ایک اک گام پہ دامن سے لپٹتی ہی رہی
میں نے دنیا کو فقط گردِ سفر جانا تھا

رخصت اے جانِ وفا، منزلِ بے نام آئی
میں ترے ساتھ چلا تھا تو کدھر جانا تھا

تجھ سے ٹکرا کے سنبھلنا تھا محبت کیا تھی
ایک طوفان کو آنا تھا گذر جانا تھا

باقر مہدی

"پرانے سوال"

ایک تارا بزم سے نکلا ہے کامل بنا
ایک آنسو خاک میں مل کر ہمارا دل بنا

آپ سے مل کر کسی کی یاد کیوں آنے لگی
رائگاں گذرا تھا جو لمحہ غم حاصل بنا

زندگی کیا ہے فقط اک موج دریسلاب ہے
جینے والوں کے لئے طوفان ہی ساحل بنا

پھر وہی چھیڑیں گے قصے پھر وہی ہونگے سوال
شاعری کے ساتھ جینا کیوں بہت مشکل بنا؟

یہ تو ہم کو بھی سودا رہا، دیکھیں بھلا
کون باغی ٹھوکریں کھا کر کہاں سائل بنا؟

ہم ترے دشمن نہیں کچھ تو بتادے راز غم
کیوں وہی سفاک نکلا جو بہت عاقل بنا؟

رازداروں میں نہیں جرأت مگر باقر تو ہے
کب فریب زندگی کا وہ بھلا قائل بنا

احقر کاشی پوری

(۲)

وقت سے اس کی رسم و راہ نہیں
عشق ورنہ کوئی گناہ نہیں

غم ہے اور آنسوؤں کی کاہکشاں
میری دنیا میں مہر و ماہ نہیں

قحط صدق و وفا بھی دیکھ چکے
اب کسی انجمن کی چاہ نہیں

گردشِ آسماں پکار ہمیں
ہم ابھی خستہ و تباہ نہیں

بتکدہ ہو کہ شیخ کی جنّت
آدمی کو کہیں پناہ نہیں

خارزارِ حیات ہے میں ہوں
بچ نکلنے کی کوئی راہ نہیں

آپ مایوس کیوں ہیں، راہزنی
بندہ پرور کوئی گناہ نہیں

خالد ندیم

(۱)

آشوبِ بلا میں ہمیں جینا نہیں آیا
امرت کی طرح زہر کو پینا نہیں آیا

ہم خاک کے ذرّے ہیں تجلّی کے بھکاری
ظلمت میں چمکنے کا قرینا نہیں آیا

مدّت سے ترے ہجر میں برسی نہیں آنکھیں
اک عمر سے ساون کا مہینا نہیں آیا

آدابِ گلستاں ہمیں معلوم نہیں ہیں
اے ساقیٔ مہوش ہمیں پینا نہیں آیا

اک بار تری بزم میں ٹوٹی تھی صراحی
پھر تذکرۂ ساغر و مینا نہیں آیا

متین سروش

○

سرورِ تازہ محبت شعار لے آئے
بسا کے جام میں خوشبوئے یار لے آئے

ہجومِ ماہ وشاں، زلفِ خم بہ خم ہے وہی
کوئی حکایتِ نو، غم گسار لے آئے

جدا ہے ذوقِ طلب، آج نازِ محبوبی
نگاہِ لطف و لبِ نغمہ بار لے آئے

نئی ادا کے ہیں مشتاق آئینہ خانے
نیا طرازِ جنوں حسنِ یار لے آئے

کمالِ مہر و وفا ہم تو یہ سمجھتے مگر
نشاطِ قلب، غمِ انتظار لے آئے

یہ کیا ہوا کہ جو خلاقِ رنگ و نکہت تھے
خزاں فروش بہاروں کا پیار لے آئے

خفا ہوں ہم سے نگارانِ شہر کیوں نہ سروش
بنا کے دل کو حریفِ بہار لے آئے

محمود ایاز

○

اب نہ دوری کی شکایت ہے نہ قربت کی لگن
جانے کس آگ میں جل بجھ گئے احساس کے بن

ان سے پیمانِ وفا جن سے تعلق نہ لگن
ہم نے کیا کیا نہ کئے تجھ کو بھلانے کے جتن

شب کی آغوش سے آئی تری قربت کی مہک
دشتِ ماضی میں کھلے ہیں تری یادوں کے چمن

کوئی یوں پاس سے گذرا کہ تری یاد آئی
وہی مہتاب سا چہرہ، وہی خوشبوئے بدن

ہم کہ وابستگیٔ شوق کے زنداں میں رہے
آشیاں چھوڑ کے نکلے تو ملے کتنے چمن

کتنے درد اٹھے تری بزم سے اٹھتے ہی مگر
نہ چھٹے ہم سے پھر آشفتہ مزاجی کے چلن

چند لمحے جو تری یاد سے غفلت میں کٹے
مجھ سے روٹھی رہی اک عمر زلیخائے سخن

اب جہاں چاہے مجھے گردشِ دوراں لے جائے
میرے خوابوں میں سلامت مری یادوں کا وطن

تلوک چند محروم

بوئے گل

فضائے دامنِ گل میں ملا مقام تجھے
ہوا نصیب نہ لیکن وہاں قیام تجھے

بہ ایں لطافت و جاں پروری و زیبائی
کیا بوقتِ سحر عزمِ دشت پیمائی

وطن سے دوشِ صبا پر سوار ہو کے چلی
چمن سے مشک فشاں عطر بار ہو کے چلی

ترے نفس سے ملا مایہ دارِ ہستی ہے!
یہ فصلِ گل ہے کہ دورانِ مے پرستی ہے

مئے سرور ٹپکتی ہے جام سے تیرے!
ہے سب کو بہرہ وری فیضِ عام سے تیرے

غضب کی اُف! تری لپٹوں میں ہے فسوں کاری
دل و دماغ پہ اک بے خودی سی ہے طاری

ہے مجھ کو تیرے مقدر پہ سخت حیرانی
جہاں کو مایۂ فرحت تری پریشانی

ریاضِ دہر میں خود ہو گئے انتشار نصیب
مشامِ خلق کو تُو نے کیا بہار نصیب

اجڑ کے خود جو ہوا کو بسا دیا تُو نے
سبق زمانے کو ایثار کا دیا تُو نے!

شفیق فاطمہ شعریٰ

خاکِ الجیریا نے کہا

بھیڑیوں کو رہا ہے سدا
حق یہاں تاخت و تاراج کا
جو چلن کل زمانے کا تھا
وہی دستور ہے آج کا
رہروِ جادۂ ارتقاء
وقت ہے شرم کا لاج کا
رہروِ جادۂ ارتقاء!

بات چھیڑو نہ تہذیب کی
جس کی بنیاد ہے جھوٹ پر
جس کی معراج ہے رہزنی
جس کا ایمان ہے لوٹ پر
خونِ ناحق کو پی کر پلی
اور بڑھتی رہی پھوٹ پر
بات چھیڑو نہ تہذیب کی

اب بھی ارزاں ہے انساں کا خوں
قیمتِ دشت و در ہے گراں
اک کرن بھی نہیں رہ نموں
امن کی روشنی ہے کہاں
لٹ گئی سب متاعِ سکوں
میرے نالے گئے رائیگاں
اپنا دل کس کے آگے رکھوں؟

نیل سے کف ابلنے لگا

کس کے گھر کا دیا گل ہوا؟ — کس کی کھیتی ہوئی شعلہ زا؟
کس کے دامن میں آنسو گرے؟ — کس کی آنکھوں سے کاجل بہا؟
کس نے گاتے ہوئے جان دی؟ — کون ہنستا ہوا کٹ مرا؟
کس گرج سے فلک ہل گیا؟

ہاں دریدہ دہنو! برادر کشو! — حسنِ دشت و دمن چھین لو!
چھین لو حسن کی دلکشی — عشق کا بانکپن چھین لو!
اٹھتے اٹھتے تم اس بزم سے — رونقِ انجمن چھین لو!
آس کی ہر کرن چھین لو!

آج ہے چھیننے کا چلن — کل کو ہو یا نہ ہو کیا خبر
تم خوشی سے اجاڑو چمن — ہے بہاروں کی آمد ادھر
چند گنتی کے ہیں راہزن — اور سارا جہاں راہبر
اور سارا جہاں ہم سفر

روحِ صحرا ہے نغمہ سرا

جاگ اٹھا مرا قافلہ
وہ پھریرا اڑا صبح کا
فصلِ زریں کی مانند آج
کٹ رہے ہیں مرے سورما
تخت شاہوں کے الٹے گئے
مژدہ لے کشتۂ کربلا

جاگ اٹھا مرا قافلہ

حریت میری شہ رگ کا خوں
مجھ کو آزادگی کا جنوں
نحر کی آگ ہے شعلہ زن
اپنا سرمایہ پھر جھونک دوں
آہ دل میں تمنا کا درد
دمبدم ہو رہا ہے فزوں

مجھ کو آزادگی کا جنوں

میرے بیٹے بڑے خود پسند
چاند تاروں پہ پھینکیں کمند
ذوقِ آزادگاں کے لئے
مرگ شیریں تر از شہد و قند
اس کا زیور شہیدوں کا خوں
میری دھرتی بڑی ارجمند

میری آتش کے شعلے بلند

شفیق فاطمہ شعریٰ

فصلِ نیک فال

اب انتظار کی گھڑیاں گراں نہیں ہوں گی
وہ میرے فصلِ گذشتہ کے ہم صفیر آئے
چہک رہے ہیں گھنی پتیوں میں چھپ چھپ کر
یہ مجھ کو موسمِ گل میں کبھی نہیں بھولے
ہمیشہ یاد کی زنجیر میں اسیر آئے
ہر اک بہار میں با نغمہ و نفیر آئے

ابھی جہاں میں کچھ ایسے بھی لوگ رہتے ہیں
کہ خواب میں بھی کبھی بھول کر نہیں آتے
رتیں بدلتی ہیں موسم خرام کرتے ہیں
بھڑک کے شمعِ رہِ انتظار بجھتی ہے
نہ کوئی نامہ نہ کوئی پیام آتا ہے
عجب اندھیرے ہیں ہم صبح و شام کرتے ہیں

وہ تاجدارِ چمن فصلِ گل کی شہزادی

اگل رہی ہے لہو دیر سے ہے فریادی
ارے ارے کہیں شق ہو نہ جائے دل اس کا
یہ اس کا ضبط یہ اس کی تڑپ یہ اس کا خروش
اک آہ بشارِ نوا گر رہا ہے تھم تھم کر،
کبھی یہ زمزمۂ دلکشا نہ ہو خاموش

ذرا سی ننھی سی منقار کی نئے نازک
لنڈھا رہی ہے خماروں کے خم خیالوں میں
انڈ رہی ہے خنک کونپلوں میں شیریں آنچ
لہوتیاں ہے شگوفوں کے سرخ گالوں میں
ٹپک رہا ہے ہواؤں سے شہد ناب کا کیف
انڈیل کے کوئی پی لے اسے پیالوں میں

پہاڑیاں ہوئیں کوکو کی گونج سے معمور
بقدر یک شرر اک دل اور اس کا یہ دم خم
کہ جان کھنچتی ہے گویا ہر ایک تان کے ساتھ

کہ گھٹ رہا ہے دھواں بن کے شعلۂ غم دل میں
یہ کیسی شکل ہے یارب جہاں میں جینے کی
کہ ہر نفس ہو نئی موت اور تازہ جنم

"مجھے خبر نہیں پنچھی، خبر نہیں مجھ کو
تجھی کو کوئی پتہ ہو تو مجھ سے کہہ دینا
کہ ہر نواح کی خوشبو ترے مشام میں ہے،
کہ دیس دیس کی پرواز کام ہے تیرا
مجھے خبر نہیں پنچھی، خبر نہیں مجھ کو
نہ پوچھ مجھ سے کہ وہ ماہ کس مقام میں ہے"۔

ترے طلسم میں ہم کھو گئے، یہ بات ہے کیا
یہ فصلِ نو ہے ہم آہنگ ہو کے گانے کی
گلوں کا خندۂ خاموش ہی غنیمت ہے
نہیں ہے فرصتِ شرح و بیاں انہیں نہ سہی
ہم اپنے نامہ و پیغام ہی کی بات کریں

کہ اک نوا سے عبارت ہے زندگی اپنی

اب انتظار کی گھڑیاں گراں نہیں ہوں گی
کہ مل گئی ہے نئی رہگذر خیال کو اب
وہ ایک لمحہ کہ جب گونجتا ہے سازِ وجود
نثار اس پہ کریں فرقت و وصال کو اب
ہر اک شگون مبارک ہے ہر گھڑی شبھ ہے
سکھائیں رمزِ جنوں فصلِ نیک فال کو اب

گداز دھوپ کی مٹے سے ہیں وادیاں لبریز
ہے ذرّہ ذرّہ سنہرے روپہلے ہالوں میں
کرن کرن میں خروشاں ہیں کام دیو کے بان
وہ دوپہر کا مسافر وہ آفتابِ عظیم
مسافتِ رہِ گردوں کو سہل پاتا ہے
فضا میں جھومتا گاتا قدم بڑھاتا ہے

نریش کمار شاد

قاشیں

شامِ غم اور صبحِ عشرت میں   کس طرح ہو سکے تمیز مجھے
گردشِ روزگار تیری قسم   تیرا ہر رنگ ہے عزیز مجھے

زمزموں کے جواں لہو سے بجھی   آگ یہ سیلِ رنگ و بو سے بجھی
حسن کو جب لگی ثبات کی پیاس   قلبِ شاعر کی آبجو سے بجھی

حادثہ ہے کہ معجزہ یارب !   رنگ غائب ہے بو سلامت ہے
دل تو مرحوم ہو چکا لیکن   دل کی ہر آرزو سلامت ہے

اتنے نادان پھر کہاں ہونگے ایسے ارمان پھر کہاں ہوں گے
تم تو مل جاؤ گے کہیں نہ کہیں ہم مری جان پھر کہاں ہوں گے

مئے پُرکیف سے جو خالی ہے ایسا خوش رنگ جام ہے شاید
لوگ جس کو خوشی سمجھتے ہیں غم نہ ہونے کا نام ہے شاید

دل پہ گذری جو واردات نہ پوچھ میری خوش قسمتی کی بات نہ پوچھ
بے ہنر مجھ سا بن گیا محمود دوستوں کی نوازشات نہ پوچھ

وحید اختر

سکوتِ شہرِ آرزو

آج اس شہر میں آیا ہوں کئی سال کے بعد

اس کی ہر راہ ہے یادوں کے نگر سے منسوب
ہر گلی کوچے میں ہیں کتنی امنگیں مصلوب
کل کسی موڑ پہ اک پل کو ٹھہرتا تھا اگر

کتنی بے نام نگاہوں کے پیام آتے تھے
کیا اداؤں سے مری سمت سلام آتے تھے
کتنی آنکھوں میں مرا نام چمک اٹھتا تھا
کتنے ہونٹوں پہ مرا پیار مہک اٹھتا تھا

کل تک اس شہر میں دشمن بھی تھے احباب بھی تھے
آج تو چند ہی چہروں سے شناسائی ہے
دل کہاں جائے جو ہر رنگ کا شیدائی ہے
یونہی بے کار بھٹکتا ہوں کہ شاید کوئی

روک کر کہہ دے بس اتنا کہ کہیں دیکھا ہے
کوئی دشمن ہی ملے، دیکھ کے جس کی صورت
یاد آ جائے کہ اس شہر سے کچھ رشتہ ہے
نہ سہی لطف تو نفرت سے مرا نام آئے
نہ سہی پیار کی باتیں، کوئی دشنام آئے
تلخ یادوں ہی سے لبریز کوئی جام ملے
آشنائی کے لئے کوئی تو الزام ملے
آج تو یاد بھی کترا کے نکل جاتی ہے
ذہن میں کھنچ کے بھی تصویر بدل جاتی ہے

*

لوگ کہتے ہیں کہ اب شہر کی رونق ہے فزوں
بستیاں اور زیادہ ہی ہوئی ہیں آباد
نئے چہرے، نئے چرچے، نئے افسانے ہیں
نئی محفل، نئے ساقی، نئے پیمانے ہیں
جنہیں کلیوں کی طرح مہر بہ لب دیکھا تھا
اب انہی پھولوں سے آباد ہے گلزارِ شباب

سوغات

کل جو مکتب ہی کی اک راہ سے واقف تھے فقط
آج وہ عشق کی ہر راہ گذر جان گئے
کل جو دل والوں میں مشہور تھے ننھے قاصد
آج وہ خط کے مضامین کو پہچان گئے
کل جنہیں آنکھ اٹھانے کا سلیقہ بھی نہ تھا
آج وہ آنکھ لڑانے کا ہنر جان گئے
ہنستے گُل مری آشفتہ سری کیا جانیں
آج جو ہنستے ہیں شبنم کی تری کیا جانیں
میں نے بھی کل یہیں ہنسنے کی ادا سیکھی تھی
وضعِ آوارگیٔ بادِ صبا سیکھی تھی
آج لوٹا ہوں تو ہنسنے کی ادا یاد نہیں
وضعِ آوارگیٔ بادِ صبا یاد نہیں
مرے گلشن کو مرا عہدِ وفا یاد نہیں
وہ ہوائیں بھی مجھے بھول گئی ہیں شاید
جن کے ہر لمس میں ہے دستِ شناسا کا اثر
وہ فضائیں بھی مجھے دیکھ کے انجان سی ہیں

سوغات

جن کے سینے میں دبے ہیں مرے ماضی کے شرر

بند ہے میرے لئے آج وہ دروازہ بھی

جس کی چوکھٹ مرے قدموں سے بسی رہتی تھی

آج گھر بھی مرا پتھر کی طرح بے حس ہے

اس کے ہر ذرے میں دل میرا دھڑکتا تھا

آج محرابوں پہ ہے گرد، دروں میں جالے

چونا جھڑتا ہوا، گرتی ہوئی مٹی چھت سے

طاق مفلس کے چراغوں کی طرح ہیں بے نور

گو کہ کل ان کی کتابوں سے بھری رہتی تھی

صحن میں خاک اڑاتی ہوئی چلتی ہے ہوا

یہ گماں بھی نہیں ہوتا کبھی رہتا تھا کوئی

جس خرابے کو رکھا مدتوں ہم نے آباد

کون اس خانۂ ویراں کو بساتا آکر!

جس کے ہر ذرے میں ہے جذب مری ماں کا لہو

کون اس خاک کو ماتھے پہ لگاتا آکر

قصر خالی نہیں رہتے ہیں مکینوں سے کبھی

کوئی مٹی کے گھروندوں میں نہیں آتا ہے
مقبروں میں بھی جلا دیتے ہیں شمعیں کچھ لوگ
یہاں کون آتا کہ قبروں کے نشاں بھی تو نہیں
شمع کیا بجھتے چراغوں کا دھواں بھی تو نہیں
ایسا سناٹا کہ آواز کا دم گھٹتا ہے
گیت پھر گیت ہیں، آوازِ فغاں بھی تو نہیں
اپنے ہی دل پہ دھڑکنے کا گماں بھی تو نہیں

*

اب تو اس گھر کی زیارت سے بھی ہول آتا ہے
جس سے ہنگامے بھی کتراتے ہوں، گھر بھی کاٹے
کوئی بتلاؤ کہ وہ شخص کہاں جاتا ہے؟

زندگی کون سا موڑ ہے یہ جہاں
میرے قدموں کی رفتار تھم سی گئی
کوئی رہرو کوئی نقشِ پا بھی نہیں
کوئی شمع سرِ رہگذر بھی نہیں
جانے کیا شب کی ویرانیوں نے کہا
میرے ذوقِ طلب میں کمی آگئی
راہ چلتے مسافر کو نیند آگئی

وقتِ آغاز جب شوق کے قافلے
ایک شہرِ تمنا کی جانب چلے
ہم سفر تھے مرے ہم نظر تھے مرے

کتنے نقشِ قدم کتنی زلفوں کے خم
کتنے چہروں کی شادابیوں کے چمن
قول، وعدے، تسلی، دلاسے، قسم

زندگی کون سا موڑ ہے یہ جہاں
وہ نقوشِ قدم ہیں نہ زلفوں کے خم
عہد و پیماں، دلاسے نہ قول و قسم
قافلے شوق کے کس طرف کھو گئے؟

زندگی کون سا موڑ ہے یہ جہاں
میرے قدموں کی رفتار تھم سی گئی
راہ ویران ہے کس کو آواز دوں؟
کوئی ایسا نہیں جو مری رہ گذر
ماہ و انجم کی شمعوں سے روشن کرے
خضر کے روپ میں آئے، آ کر کہے
آ، تجھے منزلِ آرزو سونپ دیا۔

محمود سعید

ایک خط

تجھ سے ہم آج بھی اے پیکرِ اخلاص و وفا
تو کہیں بھی ہو، وہی رشتۂ جاں رکھتے ہیں
اب یہ شکوہ ہے زمانے کا، ترے غم کو مگر
دل کی رگ رگ سے لہو دے کے جواں رکھتے ہیں

یوں تری یاد سے روشن ہوئی ہر شمعِ خیال
غمِ دنیا کو بھی ہم تیری ہی دولت سمجھے
زندگی بحرِ بلا خیز کا طوفاں تھی مگر
تیری یادوں نے ہر اک موج کو ساحل بخشے

دردِ و آلام کے طوفاں میں امانت تیری
لُٹ کے، پامالِ ستم ہو کے سنبھالی ہم نے
اک تری یاد کے جلتے ہوئے دیپک کے لئے
بزمِ عشرت کی ہر اک شمع بجھالی ہم نے!!

محمود سعید

ماں

ماں ترے خواب کی تعبیر ہی الٹی نکلی
تیرے گلشن میں بہاروں کا گذر ہو نہ سکا
زندگی بھر ترے ہونٹوں پہ دعائیں ہی رہیں
تیرے بے رحم خداؤں پہ اثر ہو نہ سکا

تیرگی تیرا مقدر تھی، مقدر ہی رہی
زندگی نور کے سانچوں میں مگر ڈھل نہ سکی
تیری بے چین نگاہوں کو سکوں مل نہ سکا
کشتِ امید تری پھول سکی پھل نہ سکی

دیکھ اس رات کے افسردہ ستاروں کے تلے
تیری ناکام امیدوں کی چتا جلتی ہے
یوں لرزتی ہے خموشی میں تری سانس کی لے
جیسے سنسان فضاؤں میں ہوا چلتی ہے

سوغات

در و دیوار کو ہمراز بنا کر ہر شب
تو اکیلے میں ہمارے لئے آنسو نہ بہا
اپنے آلام کا خود آپ مداوا ہو جا
بے زباں چاند ستاروں کو غمِ دل نہ سنا

تو نے جس باغ کو سینچا تھا لہو سے اپنے
آج اس باغ میں خاروں کے سوا کچھ بھی نہیں
تیری امید کے گلشن میں سدا خاک اُڑی
تیری محنت تیری کوشش کا صلہ کچھ بھی نہیں

غم و آلام کو تقدیر سے تعبیر نہ کر
ایک گردوں ہی نہیں اہلِ جفا اور بھی ہیں
ماں تجھے کیسے بتاؤں کہ مشیت کے سوا
اس بدلتی ہوئی دنیا کے خدا اور بھی ہیں

حمید الماس

محلکے

خنک فضا ہے ستاروں کی آنکھ بھاری ہے

★

یہ سرسراتی ہواؤں کے ریشمی جھونکے
الٹتے جاتے ہیں اوراق زندگانی کے
یہ گیت ابھرتے ہوئے چاندنی کے ہونٹوں پر
یہ ماہتاب کی دزدیدہ چپیٔ نظریں
مری اداس طبیعت کو لوریاں دے کر
مری حیات کو زنجیر سی پہناتی ہے

★

یہ میرا جرم کہ میں نے کسی کو چاہا تھا
مری خطا کہ تھیں ستراد کی کلیاں
مرا گناہ کہ رنگِ رواں تھی قبلۂ جاں

★

دیارِ دیدہ و دل کو کوئی خدا نہ ملا
کسے کہوں کہ مجھے تیرا آسرا نہ ملا

محمود ایاز

سیلِ زماں

ابھی ابھی تو شعاعِ سحر کی تابانی
تمہارے عارض و لب پر تبسّم افشاں تھی
تمہاری آنکھوں میں روشن وفا کی قندیلیں
شبِ حیات کی ہر تیرگی کا درماں تھیں

بس ایک لمحے کو جھپکی ہے چشمِ دیدِ طلب
بس ایک لمحے کو چھوٹا ہے شوق کا دامن
کھلی ہے آنکھ تو عمرِ رواں کی برق روی
بس ایک لمحے میں ہر قرب سے گذر گئی ہے
ہر ایک لمحے کو ماضی کا خواب کر گئی ہے!

کچھ اتنی تیزی سے گذرا ہے کاروانِ حیات
رفیقِ راہ جو تھے گردِ راہ میں گم ہیں
اب اس سکوتِ زمان و مکاں کی وسعت میں
ہر ایک لمحہ حائل فصیلِ آہن ہے!!

بس ایک ایک کفِ پا کا نقش دیکھتا ہوں
چراغِ لالہ سے روشن ہے ایک گلشن!!

تبصرہ نگار:۔ ڈاکٹر محمد حسن

"ایران میں اجنبی"

شاعر: ن۔م۔ راشد۔ ضخامت ۶۷۱ صفحات۔ ناشر: گوشۂ ادب چوک انارکلی لاہور میں چھپی ۱۹۵۷ء۔ قیمت چار روپے

"ایران میں اجنبی" "ماورا" کے بعد راشد کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے۔ اس کے تین ابواب ہیں۔ پہلے باب میں تیرہ قطعوں کی وہ "ناتمام نظم" ہے۔ جس کا عنوان "ایران میں اجنبی" ہے۔ اور جس میں تسلسل اور ترتیب تو موجود نہیں ہے۔ مگر ہم آہنگی ضرور ہے۔ دوسرے حصہ میں "خواب سحرگاہی" کے عنوان سے وہی متفرق نظمیں یکجا کر دی گئی ہیں۔ تیسرے باب "شباب گریزاں" میں گیارہ اسی طرح کی متفرق نظمیں یکجا کر دی گئی ہیں۔ آخری دونوں حصوں کی بہت سی نظمیں مختلف رسائل میں پہلے چھپ چکی ہیں۔ آخر میں سات غزلوں کا ایک مختصر تتمہ ہے۔

پہلا باب اس کتاب کا اہم ترین جزو ہے۔ "ایران میں اجنبی" کی تیرہ نظموں کے بارے میں راشد نے اعتراف کیا ہے کہ یہ "ایک ہندوستانی سپاہی کے تاثرات ہیں جو ذہنی طور پر ایک برعظیم کا باشندہ اور جسمانی طور پر ایک اجنبی فوج کا فرد ہے"۔ ان قطعات میں بقول شاعر:

> "جذبات کی اس کشمکش کے تجزیے کی کوشش کی گئی ہے جو خاص سیاسی حالات نے پیدا کر دئے تھے۔ یہ بکھرے ہوئے نقوش زمانے کی سیاست کے پردے پر........ بنائے گئے ہیں۔ جن میں انفرادی جذبات نے محض کشیدہ کاری کی ہے۔ اس نظم میں متعدد کردار آئے ہیں۔ لیکن سب پر سیاہ کا سایہ پڑ رہا ہے"

ان نظموں کے بارے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کی ایک واضح اور جذباتی سمت موجود ہے۔ یہ صرف بکھرے ہوئے متفرق اور متضاد نقوش کا مجموعہ نہیں ہیں۔ ان نظموں کا ایک محور ہے اور ہم آہنگی اور ربط جگہ جگہ پر نمایاں ہے۔ یہ نظمیں نہ تقابلی کے طور پر لکھی گئی ہیں۔ نہ محض اپنی تجربے کے طور پر۔ ان میں انفرادی تجربے کی حقیقی روشنی موجود ہے۔ یہ شاعر کے اپنے تجربات ہیں جنہوں نے اس کے خون کو گرمایا ہے اور اس کے

سوغات

احساس اور ادراک میں نئے پھول کھلائے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ بھی مانگے ہوئے "گوہرِ شب چراغ نہیں، بلکہ گھر کے دیئے" ہیں۔ ان کو ذاتی احساسات نے ڈھالا ہے سجایا بنایا ہے ہو سکتا ہے کہ ان خیالوں کی روشنی سب لوگوں کے لئے تسلی بخش نہ ہو۔ لیکن اس کی روشنی میں خونِ جگر کی تابناکی شامل ہے۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں۔

اس تجربے کی نوعیت بھی قدیم تجربوں سے مختلف ہے۔ وہ آویزش جو "ایران میں اجنبی" کے دل کو "دو نیم" کئے دیتی ہے۔ وہ ذہنی اور مادی وجود کی آویزش ہے۔ ایک غلام ہندوستانی سپاہی جو ذہنی طور پر ایشیا کی آزادی کا خواہشمند ہے۔ عملی زندگی میں برطانوی فوج کے ایک سپاہی کی حیثیت سے نہ صرف اپنی غلامی پر قانع رہنے کے لئے مجبور ہے بلکہ ایران

"یہ داریوش بزرگ کی سرزمین
یہ نوشیروانِ عادل کی دادگاہیں
تصوف و حکمت و ادب کے نگار خانے"

کی سرزمین میں بھی غلامی کی لعنت کا حاتی بنا ہوا ہے۔ اس کا ذہنی اور جذباتی وجود سامراج دشمن اور آزادی پسند ہے۔ لیکن عملی زندگی کی مجبوریوں نے اسے "فرنگی تہذیب کی بلی کی چھپکلی بنا دیا ہے۔" اس دردناک سمجھوتے کی داستان جگہ جگہ ان نیرہ آزاد نظموں میں بکھری ہوئی ملے گی۔

ان نظموں کے بارے میں راشد نے یہ اعتراف کیا ہے کہ "یہ نقوش زمانے کی سیاست کے پردے پر بنائے گئے ہیں"۔ پطرس نے اپنے دیباچے میں بھی یہ سوال اٹھایا ہے کہ "اس نوع کی نظموں کو کس حد تک سیاسی کہا جا سکتا ہے؟" لیکن سیاسی شاعری سے عام طور پر ایسی شاعری مراد لی جاتی ہے کہ جو فوری طور پر سیاسی مقاصد کی خاطر لکھی جائے۔ یا ہنگامی تاثرات پر مبنی ہو۔ اور ہنگامی طور پر تاثرات کو برانگیختہ کرے۔ جیسے شبلی اور ظفر علی خاں کی متعدد نظمیں۔ راشد کی یہ نظمیں ان معنوں میں سیاسی نہیں ہیں۔ سیاست یہاں مقصد نہیں ہے۔ ذریعہ ہے۔ گو عنوانات سیاسی لئے گئے ہیں۔ لیکن ان عنوانات کے ذریعہ جو بات کہنی ہے۔ وہ صرف سیاسی نہیں ہے۔ یہ آواز سماجی بے انصافی انسانی عظمت اور راست کرداری کی آواز بن جاتی ہے۔ ہر قسم کے استیصال اور دباؤ کے خلاف ایک بلند آہنگ احتجاج کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ان نظموں کا موضوع ضمیرِ انسانی کی وہ جد و جہد معلوم ہوتی ہے جو انصاف، آزادی اور راست کرداری کے لئے جاری ہے۔ یہ آزادی صرف سیاسی نہیں ہے دقیانوسی خیالات اور فرسودہ بندھنوں کے خلاف بھی ہے۔

یہاں بھی وہاں بھی وہی آسماں ہے
مگر اس زمیں سے خدا یا رہائی
خدایا دہائی !!

....

یہاں زندگی کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں
فقط شاخسار ہیں
ابھی اپنی افتاد کے حشر سے ہیں گریزاں

....

جہاں سب نگاہیں ہوں ماضی کی جانب
وہاں راہرو ہیں فقط عازمِ نارسائی"

(نارسائی)

"وزیرے چنیں" میں یہ طنز ایسے کرایے کے عمال اور وزیروں پر ہے جو اپنی قوم کو بے عقلی سے چند سکوں کے عوض بیچ رہے ہیں۔ "شاخِ آہو" میں بھی وزیرِ معارف علی کیانی دراصل انسانی ضمیر فروشی کی علامت بن گیا ہے۔ یہ ضمیر فروشی محض سیاسی نہیں ہے۔ "ایران میں اجنبی" کی فضا ایسے بہت سے کرداروں سے معمور ہے جو اپنے آپ سے بھی اجنبی ہیں اور وہ سب کچھ کر رہے ہیں جو وہ کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن تاریخی جبر کے شکار ہیں۔ "میزبان" کا فوروز۔ "ہمہ اوست" کا خالد۔ "مارسیاہ" کی یاسمن "دستِ ستمگر" کی "عندلیب لبستان" "خلوت میں جلوت" کا حسن۔ سب اسی تاریخی جبر کے شکار ہیں۔ راشد کی ان نظموں کا موضوع یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان کو اپنے خیالات و جذبات کے مطابق زندگی گذارنے کی آزادی ملنی چاہیئے۔ اسے ہر قسم کے استبداد سے آزاد ہو کر اپنے حقیقی وجود تک رسائی حاصل کرنے کی آزادی ملنی چاہیئے۔ وہ جو چاہے بن سکے اسے اپنے ذہن اور جذبے پر کسی قسم کے شکنجے کی گرفت محسوس نہ ہو۔ اسے راست کرداری اور راست گفتاری کی نعمت حاصل ہو اسی لئے راشد نے اشتراکی "ہمہ اوست" پر بار بار طنز کی ہے۔ کیونکہ عام طور پر اشتراکی عقیدے پر ایمان لانے کے بعد سارے مسائل پر آزادی سے سوچنے اور محسوس کرنے کا انفرادی حق سلب ہو جاتا ہے۔

مجھے روسیوں کی سیاسی "ہمہ اوست" سے کوئی رغبت نہیں ہے۔

مگر ذرے ذرے میں
انساں کے جوہر کی تابندگی دیکھنے کی تمنا ہمیشہ رہی ہے"
"ہمہ اوست"

اس لئے ایسے مواقع پر بھی جب راشد کی آواز خطیبانہ معلوم ہوتی ہے۔ ان کا لب و لہجہ ہمیشہ سیاسی نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ "ایران میں اجنبی" میں "ماورا" سے کہیں زیادہ سچائی نکھرے ملتے ہیں اور وہ مایوسی اور قنوطیت جو "ماورا" میں احساس غلامی کے ساتھ جلوہ گر ہوتی تھی یہاں تقریباً مفقود ہے۔

"۔۔۔ اور اب عہد حاضر کے ضحاکؔ سے
رستگاری کا رستہ یہی ہے۔
کہ ہم ایک ہو جائیں، ہم ایشیائی
وہ زنجیر جس کے سرے سے بندھے تھے کبھی ہم
وہ اب سست پڑنے لگی ہے۔
تو آؤ کہ ہے وقت کا یہ تقاضہ
کہ ہم ایک ہو جائیں — ہم ایشیائی" (نارسائی)

یا "دست ستمگر" میں لکھتے ہیں
"بکھر جائے گا جلد
افسردہ حالوں کا، خانہ بدوشوں کا یہ قافلہ بھی
اور اک بار پھر عافیت کی سحر
اس کا نقش کف پا بنے گی"

یا "درویش" کے یہ مصرعے:
"سیاست نے سوچا ہے
تیری زبان بند کر دے
سیاست کو یہ کیوں خبر ہو
کہ لب بند ہوں گے۔"

تو کھل جائیں گے دستِ دبادد"

. . . . . .

" نو آموزِ مشرق کے
نوخیز آئین کے تازیانو
سکوتِ گدا سے
گدائی تو ساکت نہ ہوگی "

یا "تیل کے سوداگر" میں یہ لہجہ اور بھی زیادہ بھرپور اور امید افزا ہے۔

مگر وقت محراب ہے
اور دشمن اب اس کی خمیدہ کمر سے گذرتا ہوا
اس کے پچھلے افق پر لڑھکتا چلا جا رہا ہے"

. . . . . .

" مرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو
کہ دیکھی ہیں میں نے
ہمالہ، دالوند کی چوٹیوں پر انا کی شعاعیں
انہیں سے وہ خورشید پھوٹے گا آخر
بخارا سمرقند بھی سا لہا سال سے
جس کی حسرت میں دریوزہ گر ہیں "

" پطرس نے "تمہید" میں راشد کی شاعری کو شدت اور شوکت کی شاعری قرار دیا ہے۔ یہ تسلیم کیا ہے کہ شدت کے جوش میں کبھی کبھی ان کی طنز تلخی میں ڈھل جاتی ہے اور جھنجلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے جو اچھی شاعری کو مجروح کرتی ہے۔ یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے،۔۔ لیکن یہ بات غالباً اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ راشد کی شاعری ایلیٹ کی قائم کی ہوئی تین آوازوں میں سے دوسری آواز کے تحت آتی ہے یعنی وہ اس قسم کی شاعری ہے جس میں۔۔۔ قارئین سے تخاطب کا لہجہ برقرار رکھا گیا ہے۔ ایلیٹ نے شاعری کی پہلی آواز اسی کیفیت کو قرار دیا تھا۔ جس میں شاعر اپنی ذات میں اس قدر محصور رہتا ہے کہ اس کی نظر ماورائے ذات سے ہٹ جاتی ہے۔ اس کے بعد تہذیبی اور ذہنی ارتقا خطابیہ

شاعری تک پہنچتا ہے۔ اور پھر تیسری منزل اس شاعری کی ہے جس میں زندگی کی خارجی تصویریں اس معنویت اور لطف سے پیش کی جائیں کہ قارئین خود ان سے مناسب نتیجے نکال سکیں اور اس منزل کو ایلیٹ نے منظوم ڈرامے کی منزل قرار دیا ہے۔

یہاں شدت اور شوکت، طنز اور تلخی کی ساری بحث اس مسئلہ پر مرکوز ہو جاتی ہے کہ راشد کی تکنیک کیا ہے یہ ظاہر ہے کہ راشد کے لئے تکنیک کے انتخاب کا سوال عام شعراء کے مقابلہ میں کہیں زیادہ پیچیدہ اور دشوار تھا۔ سب سے پہلے تو اس وجہ سے کہ راشد کے تجربوں کی نوعیت قدیم تجربوں سے مختلف ہے۔ سیاسی استبداد کی کہانی میں شعریت اور رنگینی پیدا کرنا دشوار ہے۔ یہ تجربہ فی نفسہٖ بڑا غیر شاعرانہ سا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کام اس لئے اور بھی دشوار ہو گیا کہ راشد نے قدیم نظم نگاری کے وزن اور قافیے کے سلسلہ میں اجتہاد برتا اور آزاد نظم کو اپنایا یعنی موضوع کی نثریت اور پھیکے پن کو رنگین اور شاعرانہ بنانے کے علاوہ آزاد نظم میں قافیے کا سہارا لئے بغیر موسیقی اور ترنم پیدا کرنے کا مسئلہ بھی پیش نظر تھا۔ تیسرے تکنیک کا انتخاب اس لئے بھی دشوار تھا کہ نئے موضوع اور مواد کے پیش نظر نئی علامتوں اور استعاروں کا استعمال کرنا ضروری تھا۔ اور چونکہ یہ علامتیں عام طور پر مانوس نہیں ہیں۔ اس لئے ابہام پیدا ہونے کا خطرہ بہر حال موجود رہتا ہے۔

اب ان تینوں مسائل پر الگ الگ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ مواد کی نثریت اور پھیکے پن میں راشد نے کبھی تو جنس اور رومان کے تذکرے سے رنگینی پیدا کی ہے۔ کبھی تشبیہ و استعارے کی ندرت کی مدد سے کبھی طنز کی لطافت اور شدت سے اور کبھی داستان اور کردار نگاری کی چاشنی سے جنس اور رومان کے تذکرے میں سخت نشہ ہوتا ہے۔ جو فوری طور پر ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جنس کا ذکر جہاں جہاں آیا ہے۔ اکثر جگہ اس کی وجہ سے موضوع کی سنجیدگی مجروح ہو گئی ہے۔ "بہ ذات ما در حیاہ" "میزبان" "خلوت میں جلوت" "کشاکش" اور "سرگوشیاں" میں جنس کے تذکرے نے سطحیت پیدا کر دی ہے جنس کا تذکرہ برا نہیں۔ لیکن اس میں آلودگی پیدا ہونے کا انداز یقیناً اصل موضوع سے توجہ ہٹا دیتا ہے۔ اور بیانِ سخن کا پردہ ابن جاتا ہے۔ جنس یہاں راشد کی کمزوری کی شکل میں نظر آتی ہے اور اس کی چاشنی اصل موضوع کی خشکی میں سستی رنگینی پیدا کر کے اصل بیان کو الجھا دیتی ہے۔

تشبیہیں اور استعارے راشد کی کمزوری نہیں ہیں۔ آزاد نظم لکھنے والوں میں سے

سوغات

اکثر شعرا تشبیہ و استعاروں کی بھرمار سے نظم میں دلچسپی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ راشد نہ تشبیہوں کی تکرار کرتے ہیں نہ ان پہ تکیہ کرتے ہیں۔ ہاں نئی تشبیہ کی کاوش ان کے یہاں ملتی ہے۔ راشد کی تشبیہیں اور استعارے ان معنوں میں یقیناً قابل ستائش ہیں کہ انہوں نے ان کا دامن بہت کچھ وسیع کیا ہے۔ اور شاعری کے مزاج کو سمجھ کر انہوں نے نئی فارسی ادبیات سے بہت کچھ تشبیہیں لیں اور اس کے ساتھ ساتھ جدید دور کی روزانہ زندگی سے اور مغربی شاعری میں سے بہت کچھ اپنایا۔ ان تشبیہوں، استعاروں اور تلمیحوں میں یہ قباحت ہے کہ ان میں فارسی زدگی کہیں کہیں بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ یہ بات راشد کی شاعری کی عام زبان کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے مثلاً یہاں آٹھ نظموں کی غیر مانوس فارسی تشبیہوں، ترکیبوں اور الفاظ کی ایک مختصر فہرست دی جاتی ہے۔

زنگوے۔ سہل انگارسی نال۔ یخ کے ٹکڑے۔ نجاری۔ لولی گری۔ ہیکل تراش۔ گلگونہ ملنے۔ کر۔ پروردۂ عشوہ بازی۔ حسابی (لگارٹ) مشتری (بمعنی خریدار) ملفوف ازل لطف آساں، بودہ۔ صحرائے دیروز۔ مشکینہ رعنائیاں۔ روح شب گرد۔ شب ماندہ ٹکڑے شاخسار شکستہ۔ آہنگ رنگ و زباں۔ تنہائی سخت۔ لب دوختنہ۔ شیشۂ کور۔ دار تیغ بزرگ۔ سیہ پوست دشمن۔ عقیم بیوہ۔

راشد کی اختیار کی ہوئی چند تشبیہوں اور ترکیبوں میں تو اردو شاعری کے مزاج سے وہ ہم آہنگی موجود ہے جو ان کے قبول عام کی ضمانت کرتی ہے۔ لیکن اکثر بہت گرانبار اور غیر مانوس ہو جاتی ہیں جس سے تعقید پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بات کا خواہ مخواہ کے پھیر اور الجھاؤ کی وجہ سے گرا ہو جاتا ہے اور کبھی اس میں اس قدر فارسیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس پر غالب کی بیدل زدہ شاعری کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اور اس طرح اس کی شاعرانہ فضا مجروح ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر "انقلابی" کا پہلا بند تعقید اور بے جا پھیر پھار کا نمونہ ہے۔

"مؤرخ مزاروں کے بستر کا بار گراں
عروس اس کی نارس تمناؤں کے سوز سے

آہ برلب
جدائی کی دہلیز پر، زلف درخاک، نوحہ کناں

سوغات

یہ ہنگام تھا، جب ترے دل نے اس غمزدہ سے
کہا لاؤ، اب لاؤ — دریوزۂ غمزۂ جاں ستاں"

یا ملاحظہ ۔ زندگی کے نمونے کے طور پر مصرعے ملاحظہ ہوں :

زندگی ہیزم تنور شکم ہی تو نہیں۔ (سوغات)

یہ سوچا تھا شاید
کہ خود بیٹے اس بعد کے آفرینیدہ بن جائیں گے
[اب جو اک بحر خمیازہ کش بن گیا ہے] [دوری]

اور یہ دونوں باتیں وہ ہیں جو آزاد نظم کہنے والوں میں سے اکثر نے راشد سے سیکھی ہیں اور جن کی وجہ سے آزاد نظم کو اس کی حقیقی جگہ اب تک نہیں مل سکی۔ آزاد نظم میں ابہام کی جو شکایت کی جاتی ہے وہ اکثر عجز بیان کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور کبھی کبھی ندرتِ خیال کا۔ آزاد نظم کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ اس کی شاعرانہ زبان اور روزمرہ کی بول چال کی زبان میں کم سے کم فرق ہو۔ اگر آزاد نظم نے بھی تھوڑے دنوں میں ایک غیر حقیقی شاعرانہ زبان اصطلاحات اور علامتیں اختیار کرلیں تو جس مقصد کے لئے اسے اختیار کیا گیا ہے۔ وہ فوت ہو جائے گا۔ تراکیب ڈھالتے وقت یہ خیال رکھنا چاہئے کہ ان سے الجھاؤ پیدا نہ ہو۔ اور نامانوس نہ ہوں۔

راشد کی تشبیہوں اور استعاروں میں مغربی انداز ہے TRANSFERED EPITHET کا استعمال وہ اکثر جگہ کرتے ہیں۔ بے جان اشیا پر انسانوں کی کیفیات اور خصوصیات کا اطلاق کر دیتے ہیں۔ اور ایک کیفیت کو مستعار لے کر دوسری کیفیت یا دوسرے شئے سے جا ملاتے ہیں۔ اس پر ممکن ہے قدیم طرز خیال کے بزرگ ناک بھوں چڑھائیں۔ لیکن جو لوگ نئی شاعری کے مزاج سے واقف ہیں وہ ان سے لطف اٹھائیں گے۔ راشد نے بہت سی خوبصورت اور نئی IMAGES پیش کی ہیں۔ اور ان تصویروں میں بڑی تابناکی اور کیفیت موجود ہے۔

"یہ درویش
جس کے ابّ وجد

سوغات

وہ صحرائے دیروز کی ریت پر
تھک کے مر جانے والے
اسی کی طرح تھے" (درد لیش)

"ہر اک برج و بارو پر اپنے نگہباں چڑھا دو
گھروں میں ہوا کے سوا،
سب صدا اُن کی شمعیں بجھا دو!
کہ باہر فصیلوں کے نیچے
کئی دن سے رہزن ہیں خیمہ فگن" (تیل کے سوداگر)

راشد نے بہت سے نئے رمز و کنایے بھی ڈھالے ہیں۔ نئی علامتوں کی تراش خراش کی ہے اور جگہ جگہ جامع اشاروں سے کام لیا ہے۔ ان کی دنیا شہرزاد، پتھر کے بت بننے والے شہزادے غزنوی، عجوزہ، سومنات، گل چہرہ کنیزوں اور دل شاد غلاموں کی دنیا ہے۔ اور قدیم اساطیری زبان کو انہوں نے نئی معنویت بخشی ہے۔ جس کے انداز و آداب نئے شاعروں کو سیکھنے چاہئیں۔ یہ کیفیت اسی وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب شاعر کا اپنا اندازِ فکر ہو۔ اس کے پاس کہنے کے لئے کوئی بات موجود ہو اور اس کی شاعری محض بکھرے ہوئے تاثرات کا آئینہ خانہ نہ ہو۔ بلکہ اس کے فکر اور جذبہ کی سمت متعین ہو چکی ہو اور اس کا تعین اس نے خود کیا ہو۔

رنگینی پیدا کرنے کا تیسرا ذریعہ طنز اور شدت ہے۔ طنز راشد کی کمزوری ہے کیونکہ اکثر ضبط و احتیاط کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ اور تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ طنز بڑی احتیاط سے استعمال کئے جانے والا ہتھیار ہے جو راشد کے ہاں یہ احتیاط شاذ ہی ملتی ہے میزبان کا ذکر جس کے سلسلہ میں ہو چکا ہے۔ "ہمہ اوست"۔ "وزیرے چنیں"۔ "شاخِ آہو"۔ "تہمت اور سرگوشیاں"۔ طنزیہ نظمیں ہیں لیکن ان میں "وزیرے چنیں" اور کسی حد تک "شاخِ آہو" ہی تلخی سے بچ سکی ہیں۔

جہاں تک کردار نگاری اور داستان کی چاشنی کا سوال ہے۔ اس کے بارے میں راشد نے

اعتراف کیا ہے۔

> "ایران میں اجنبی" کے بعض قطعے محض منظوم مختصر افسانہ ہیں
> جن میں زیادہ زور کسی کردار کی تصویر کشی پر ہے۔ یا کسی واقعے
> کو بیان کرنا ہے تاکہ اس سے وہ تاثر پیدا ہو سکے جو شاعر کے دل
> پر ہوا تھا۔ بعض نظموں کی حیثیت اسکیچ یا اگکارے کی سی ہے
> بعض خود کلامی سے زیادہ نہیں"۔ (دیباچہ)

جہاں تک اس افسانوی یا ڈرامائی عنصر کا تعلق ہے راشد نے بڑی کامیابی سے انھیں نظم میں نبھایا ہے۔ پس منظر کے بیان میں، خارجی منظر کے ذکر اور افراد اور ان کے کرداروں کے خاکے پیش کرنے میں بھی وہ شاعرانہ اور مصورانہ چابک دستی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ مکالموں میں وہ عام طور پر روزمرّہ کی گفتگو کی زبان استعمال کرتے ہیں، اور اسے غیر شاعرانہ نہیں بننے دیتے۔ لیکن ایسی نظموں میں جہاں واقعات بیان نہیں کئے گئے ہیں اور صرف مکالمے نظم کر دئے گئے ہیں ان کی زبان ثقیل اور غیر حقیقی سی ہو گئی ہے۔ "سرگوشیاں" اس کی ایک مثال ہے۔ منظوم افسانے کے اعتبار سے "نارسائی"، اور "نیرے جبیں" کامیاب ترین کہی جا سکتی ہیں "خلوت میں جلوت" اور "بہار دست" کامیاب نظمیں نہیں ہیں۔ لیکن ان میں یہ تکنیک ضرور خوبی سے برتی گئی ہے۔

"ایران میں اجنبی" صرف راشد کی شاعری ہی میں سنگ میل کی حیثیت نہیں رکھتی۔ بلکہ آزاد نظم کی تاریخ میں بھی اس کی حیثیت سنگ میل کی ہے...... راشد کی "ماورا" میں یاس، قنوطیت اور جھنجلاہٹ نمایاں تھی ابہام کا رنگ گہرا تھا۔ اور وقت کے مذاق کے مطابق جنس کے تذکرے اور بغاوت کے انداز منفی طریقہ پر اجاگر ہوئے تھے۔ اس سے لوگوں میں یہ خیال بھی عام ہو گیا تھا کہ آزاد نظم لازمی طور پر قنوطی اور تشکیک زدہ لب و لہجہ کی شاعری ہی کے لئے موزوں ہے۔ بس میں کلبیت اور یاس لازمی ہیں۔ لیکن راشد کے اس دوسرے مجموعے سے بھی اس دعوے کی تکذیب ہوتی ہے۔ اس سے قبل اختر الایمان کی چند اور سردار جعفری اور دوسرے شعراء کی اکثر نظمیں اس مفروضے کو غلط ثابت کر چکی تھیں۔ لیکن اب "ایران میں اجنبی" نے اس دعوی کو حرف باطل قرار دے دیا ہے۔ "ایران میں اجنبی" کے ہر باب میں امید اور رجائیت کی کرنیں بکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔

راشدؔ نے ایک نیا شعری پیکر تراشا ہے۔ اس میں صرف حسن و عشق کی لذت نہیں ہے نہ صرف تلخی، دکھ درد اور سوز و گداز کی متاع ہے۔ بلکہ اس بات کی کوشش کی گئی کہ ذات اور داخلیت کے حدود کی توسیع کی جائے اور زندگی کے اہم مسائل سیاست اور معاشرت کی کشمکش اور آویزش کو بھی داخلیت کا جزو بنا لیا جائے۔ اور ان بظاہر خشک موضوعات میں شعریت اور رنگینی پیدا کی جائے۔ اس نئے شعری پیکر میں راشدؔ نے قدیم غزل گوئی کی عام نہج سے ہٹ کر نئی چاشنی پیش کی ہے۔ کہیں طنز کے روپ میں۔ کہیں ذہنی آزادروی کی شکل میں۔ کہیں کردار کے خاکے بنا کر، اور کہیں منظوم افسانے کی شکل میں۔ سیاسی بصیرت، طنز، کردار نگاری داستان گوئی کے لطف اور نئے استعاروں اور علامتوں کی چاشنی سے جو نیا شعری لب و لہجہ بنا ہے اس میں بڑی آفاقیت اور وسعت ہے۔ اور زندگی کے بوقلموں مسائل اور افکار و جذبات کو سمو لینے کی پہنائی پیدا ہو گئی ہے۔ علم و عرفان کو شعری پیکر میں ڈھالنا اور ان میں رنگینی اور شعریت پیدا کرنا مشکل مگر ضروری کام ہے۔

نئی نسل کو راشدؔ سے یہ گر سیکھنا چاہیے کہ شاعری بغیر ایک ہمہ گیر اور مربوط نقطۂ نظر کے اور ذاتی تجربے کی روشنی میں بنائی ہوئی فکری شاہراہ کے بغیر زیادہ دور تک نہیں جا سکتی۔ ذاتی غور و فکر اور شخصی فلسفۂ حیات کی شاعری میں بڑی ضرورت ہے۔ شاعر کو صرف آگاہِ ذات ہی نہیں۔ آگاہِ کائنات بھی ہونا چاہیے۔ یعنی وہ اپنے عہد کے مجموعی علم کے بنیادی خاکے سے بے بہرہ نہ ہو۔ اور اپنے دور کے احساس کی مختلف تہوں سے روشناس ہو۔ دوسرا اہم سبق یہ ہے کہ رنگینی اور شعریت صرف چند موضوعات تک ہی محدود نہیں بلکہ ہر وہ موضوع اور نفسِ مضمون رنگین اور شاعرانہ ہو سکتا ہے۔ جسے شاعرانہ تخیل اپنی پوری قوت کے ساتھ گرفت میں لے لے۔ "آزاد نظم" میں موسیقی، قافیے، ردیف اور ارکانِ شعر کی یکسانیت کے بغیر قائم رکھنا ہوتی ہے۔ راشدؔ کی تکنیک اور اندازِ بیاں اس لحاظ سے قابلِ تقلید ہیں وہ قافیوں کی جھنکار سے کام لیتے ہیں۔ لیکن ان قوافی کو زنجیرِ پا بننے نہیں دیتے۔ اس کی ایک مثال "سبا ویراں" سے پیش کی جاتی ہے۔

"گیاہ سبزہ و گل سے جہاں خالی

ہوائیں تشنۂ باراں

طیور اس دشت کے منقار زیرِ پر

توسرمہ در گلو انساں

سلیماں سربزا تو اندر باد یراں

یہاں مستزاد کی تکنیک بڑی کامیابی سے استعمال کی گئی ہے۔ یا نمرود کی خدائی سے یہ اقتباس دیکھیے۔

"عجم وہ حرز طلسم درنگ وخیال ونغمہ
عرب وہ اقلیم شیر و شہد و شراب وخرما
فقط نوا سنج تھے در و بام کے زیاں کے
جوان پہ گذری تھی
اس سے بدتر دفنوں کے ہم صید ناتواں ہیں
کوئی یہ کس سے کہے
در و بام
آہن و چوب صنگ و سیماں کے
حسن پیوند کا فسوں تھے"

البتہ راشد کی ترکیبوں کو اختیار کرتے وقت ان کی تعقید اور ضرورت سے زیادہ فارسی آلودگی سے خبردار رہنا چاہیئے۔ جس کی مثالیں "حسن پیوند کا فسوں" میں نظر آتی ہے۔ یا "میزبان" میں "سوادکتابی کی لذات سے بے خبر" اور "بالوں میں ایک تار خاکستری تک ہویدا نہیں ہے" کی شکل میں دکھائی دیتی ہیں۔ حالانکہ ان باتوں کو واضح اور سیدھے سادھے الفاظ میں کہا جا سکتا تھا۔

کچھ جگہ راشد سے محاورہ اور زبان کے سلسلہ میں بھی تسامح ہوا ہے۔ مثلاً وہ دھڑام سے گرا ہے" حالانکہ "دھڑام سے گرنا ہونا چاہیئے۔ (میزبان)

(۲) "آشفتہ حال بھی بے نشاں ہو چکے تھے" (دست ستم گر)
آئندہ جو صفت ہے اسے اسم کی طرح استعمال کیا گیا ہے حالانکہ مستقبل اور حال ہونا چاہیئے۔

(۳) "جنھیں تشنگی کے لئے سیرابی کی پوشیدہ راہوں کی ساری خبر ہے" (سایہ)

یہاں سیرابی کا محل ہے سیرابی کا نہیں

۴ "پی رہے تھے جام پہ جام ہم" (کونسی الجھن کو سلجھاتے ہیں ہم)

یہاں "ہم" غیر ضروری اور غلط ہے۔

۵ "وہ ستم ہے کہ ہیں رہا نہ خرد نہ سر جنوں" (غزل نمبر ۷)

یہاں "پئے خرد" کا استعمال مناسب نہیں۔

اس قسم کی اور بھی کئی فروگذاشتیں مل سکتی ہیں۔

یہاں "ایران میں اجنبی" کے صرف پہلے باب کے تفصیلی تبصرے پر اکتفا کیا گیا ہے باقی دو حصوں کی نظموں کا تذکرہ مختصر طور پر کہیں کہیں آگیا ہے۔ لیکن اس تفصیلی تبصرے کی روشنی میں باقی دونوں ابواب کو بھی پرکھا جاسکتا ہے۔ غزلوں کے بارے میں بھی راشد نے معذرت کا لہجہ اختیار کیا ہے کہ اس کی "صناعی" آزاد نظم کی صناعی سے مختلف ہے"۔ اور یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے "اپنے لئے اسے کبھی موزوں ذریعۂ اظہار نہیں پایا" اور "بیشتر تقلیداً غزلیں کہی ہیں۔ لیکن ان غزلوں میں پھیکا پن اور بے نمکی نہیں ہے۔ یہ غزلیں دلچسپ اور خوشگوار ہیں

مجموعی طور پر "ایران میں اجنبی" ہماری جدید شاعری میں اہم صحیفے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور ممکن ہے یہ ایک بار پھر نئی نسل کو آزاد نظم کے امکانات پر غور کرنے اور ان سے بہتر طریقے پر کام لینے پر آمادہ کرے

تبصرہ نگار: محمود ایاز

دُرِّ شہوار

مصنف:۔ جان اسٹین بک۔ مترجم: ممتاز شیریں۔ ناشر: مکتبۂ شعور، کراچی۔ قیمت: تین روپے

"درِّ شہوار" اسٹین بک کے ناول THE PEARL کا ترجمہ ہے۔ اسٹین بک کا امریکہ کے مقبول ناول نگاروں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کے کئی ناول فلمائے بھی جا چکے ہیں۔ "دی پرل"

اگر ان کا بہترین ناول نہ بھی ہو تو کم از کم ان کی اچھی تخلیقات میں اس کا شمار ضرور ہونا چاہیئے۔ اس ناول کے بعد اسٹین بک نے BURNING BRIGHT لکھی۔ لیکن ان دونوں کتابوں سے ان کے متعلق جو توقعات بندھ چلی تھیں وہ زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکیں۔

THE SHORT REIGN OF PIPPIN IV اور SWEET THURSDAY نے اسٹین بک کے متعلق تمام خوشگوار امیدوں کا خاتمہ کر دیا۔ اسٹین بک کی ادبی زندگی میں یہ کوئی نیا واقعہ نہیں۔ انہوں نے اب تک کوئی بیس سے زیادہ ناول لکھے ہیں۔ اور ہر ایک اچھی کتاب کے بعد جب ان کے متعلق نقاد پر امید ہونے لگتے تو وہ کوئی ایسی چیز لکھتے جو ساری امیدوں پر پانی پھیر دیتی۔ ان کی اس ناکامی میں ان کی ذہنی ساخت اور نظریۂ حیات کا بہت بڑا دخل ہے۔

اسٹین بک کے پاس مشاہدہ اور تخیل کی قوت ہے۔ لیکن اس مشاہدہ سے وہ اس طرح اور اس قسم کے نتائج کا استنباط کرتے ہیں کہ اہمال اور فلسفہ میں بہت کم فرق باقی رہ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ فنکارانہ صلاحیتوں اور طرز و اسلوب کی سحرکاری کے باوجود آج بھی ان کے متعلق ایڈمنڈ ولسن کی رائے ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ (IT IS HARD TO FEEL THAT ANY OF HIS BOOKS SOFAR IS REALLY FIRST RATE). ولسن نے یہ بات ۱۹۴۱ء میں کہی تھی۔ اور اس وقت تک اسٹین بک کی وہ کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ جن کا آج بھی ان کی بہترین تخلیقات میں شمار کیا جاتا ہے

اسٹین بک کے ہاں موجودہ دور میں جس "رمزیت" اور "گہری معنویت" کا سراغ لگایا جا رہا ہے۔ اس کے متعلق کم از کم مجھے کوئی زیادہ خوش فہمی نہیں ہے۔ اسٹین بک اپنی فنی صلاحیتوں سے معجزے تخلیق کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے صرف شعبدہ بازی پر اکتفا کر لی۔ اب ان شعبدوں میں "زیریں، رمزی اور آفاقی حقیقت" کو اجاگر دیکھنا۔ "مئے دو سالہ و معشوق چاردہ سالہ" کی متصوفانہ تشریح سے کم نہیں ہے۔

"PASTURES OF HEAVEN" OF MICE AND MEN اور THE PEARL کے تمثیلی انداز بیان سے مجھے انکار نہیں۔ لیکن ان تمثیلات کے پیچھے جو معنویت پیش کی گئی ہے اس کی گہرائی اور اہمیت کے متعلق میں مشکوک ہوں اسٹین بک جس سطح پر انسانی فکر و عمل کو دیکھتے اور پیش کرتے ہیں وہ حیوانی ہے جس کا امتیازی جزو کو

بھی اعتراف ہے۔

اسٹین بک کے کسی کردار میں اس روحانی کشمکش اور گہری اخلاقی جد وجہد کا شائبہ تک نہیں ملتا جو انسان کو ارادہ اور اختیار کی قوت بخشتی ہے۔ اس کشمکش اور جد وجہد کا عنصر ہی انسان کی "انتشار" کو بھی ایک بڑے المیہ کی شکل دے سکتا ہے۔ "درشہوار" میں ممتاز شیریں کو انسان کا تصور اسٹین بک کی دوسری تحریروں کی بہ نسبت زیادہ اونچا نظر آتا ہے۔ حالانکہ BURNING BRIGHT میں MORDEEN - JOE SAUL اور FRIENDED کے کردار زیادہ بلند اور دقیع ہیں۔ بلکہ یہ ناول تو میرے خیال میں اسٹین بک کی تمام تحریروں میں سب سے زیادہ مکمل اور گہری چیز ہے۔ گو GRAPES OF WRATH کی طرح اس ناول میں بھی ضرورت سے زیادہ ڈرامائیت اور خطابت کا انداز غالب آگیا ہے۔ اگر یہاں اسٹین بک ذرا ضبط اور ضبط سے کام لیتے تو یہ ناول بہت بلند ہو سکتا تھا۔ دراصل ڈرامہ اور ناول کی ایک امتزاجی شکل پیدا کرنے کی کوشش بھی "برننگ برائٹ" سے اس کی بلندیوں کو چھین لیا "درشہوار" میں ترجمہ کے ساتھ ممتاز شیریں کا ستر صفحات پر مشتمل ایک مقدمہ بھی شامل ہے جس میں امریکی ناول کی پیدائش اور ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مغربی ادب سے ناواقفیت اور لاعلمی نہ صرف اردو کے قارئین بلکہ بیشتر ادیبوں میں بھی عام ہے۔ اور اس اعتبار سے ممتاز شیریں نے اردو کی بڑی خدمت کی ہے کہ وہ بالعموم اپنے مضامین میں اپنے انگریزی مطالعہ کا نچوڑ پیش کر دیتی ہیں۔ اور اپنے ذوق ادب، مطالعہ کی وسعت اور محنت کی وجہ سے وہ یہ کام جس سلیقہ اور تخلیقی صلاحیت کے ساتھ کرتی ہیں وہ اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔

جہاں تک ناول کے ترجمہ کا تعلق ہے مجموعی اعتبار سے ترجمہ اچھا ہوا ہے۔ لیکن کہیں کہیں اور بہتر ہو سکتا تھا۔ جیسے تیسرے اور چوتھے باب کے ابتدائی پیراگراف۔ بعض مقامات پر لفظی ترجمہ کی وجہ سے ناگوار حد تک روانی اور بہاؤ میں کمی آگئی ہے۔ یہ سب چیزیں ایک نظر ثانی میں دور ہو سکتی تھیں۔

اردو میں مختلف زبانوں کے اچھے ناولوں کے تراجم شائع کرنے کا جو سلسلہ مکتبۂ شعور نے شروع کیا ہے وہ افادیت سے خالی نہیں۔ لیکن ناولوں کا انتخاب اگر صحیح نہ ہو تو اس مہم کا مقصد پوری طرح حاصل نہ ہوگا۔ زیر نظر ناول ٹائپ میں چھاپا گیا ہے۔ اور گٹ اپ کے اعتبار سے خوبصورت

اور دیدہ زیب ہے۔ لیکن اس قسم کے سلسلوں کو زیادہ سے زیادہ کم قیمت ہونا چاہیئے۔ اگر اسی ناول کے اندرونی صفحات کو مصوّر و مزیّن نہ کیا جاتا تو پورا ناول مقدمہ سمیت ۲۰۰ صفحات میں آسکتا تھا۔ اور اسی تناسب سے قیمت بھی کم ہو سکتی تھی۔

تبصرہ نگار:۔ محمود سعید

شہرِ آرزو

مصنف: باقر مہدی۔ ناشر: گوشۂ ادب ۲۱ ارکیڈیا بلڈنگ بمبئی۔ قیمت: ساڑھے تین روپے

اردو شاعری کی تاریخ میں سنہ ۳۶ء کے بعد کا دور بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ہمارے بہت سارے اردو کے جدید شاعروں نے اسی دور میں اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ اس دور میں نظریاتی اعتبار سے اردو شاعری میں ایک عظیم انقلاب پیدا کرنے کی شعوری کوششیں کی گئیں۔ بہتر نظامِ حیات اور صحت مند معاشرے کے حصول کی خاطر جو نظریہ عروج و مقبول ہو چلا تھا وہ انسانی زندگی کے بعض فوری تقاضوں کی تکمیل کا حسین و خوش کُن تصور پیش کرتا تھا۔ عام انسانوں کے لئے اس نظریہ میں خوش فہمیوں کا کافی سامان موجود تھا۔ محرومیوں اور نا آسودگیوں کے مارے ہوئے انسانوں کا ایک ہجوم اس "حسین منزل" کی تلاش میں نکل پڑا۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر چالاک قسم کے سیاسی شاطروں نے ادیب، شاعر اور فنکار کا منصب۔ اپنی تخلیقات کے ذریعہ سیاسی اور سماجی حالات پر اثر انداز ہونا قرار دیا۔۔۔۔۔ محض انسانی تخیل کی پر اسرار راہوں میں آوارہ بھٹکنا اور ان دیکھے خوابوں کی طلسمی کیفیات کی بازآفرینی ہی نہیں، بلکہ حقیقی زندگی کو سنوارنا۔ سماجی ناانصافیوں کو مٹا کر ہر انسان کو زندہ رہنے اور خدا کی نعمتوں سے لذت اندوز ہونے کے یکساں مواقع فراہم کرنا ادیب و شاعر کا اولین فرض ٹھہرایا گیا۔ شاعروں کی ایک اچھی خاصی تعداد ایک قافلے کی صورت

میں اس دنیا کی لگن میں چل پڑی۔ اس قافلے کے ہر شاعر کے ذہن و تصور میں آرزوؤں اور امیدوں کی ایک چھوٹی سی UTOPIA بسی ہوئی تھی۔ ہر ایک اپنی اسی UTOPIA کو حقیقت کے روپ میں بدلتے ہوئے دیکھنے کا متمنی تھا۔ اپنی اس مفروضہ فردوس کے حصول سے ہونے والی خوشی کا تصور اسے کبھی مدہوش اور سرشار کر دیتا تو کبھی اس کے ناممکن الحصول ہونے کے خیال سے وہ رنجیدہ ہو جاتا۔ ذہنی اعتبار سے بڑی حد تک باقر مہدی شاعروں کے اسی قافلے کے فرد ہیں۔ گو اس قافلے کے بہت کم شاعر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ؎

آئینہ مہتاب لئے آئے ہیں ✤ شعروں میں مئے ناب لئے آئے ہیں
اس دورِ حقیقت میں بھی اے فنکار ✤ ہم کتنے حسین خواب لئے آئے ہیں

"دورِ حقیقت" میں خوابوں کی باتیں کرنا خواہ وہ کتنے ہی حسین کیوں نہ ہوں یقیناً جرأت طلب اقدام ہے۔ شاعری سے متعلق باقر مہدی کا یہ نقطۂ نظر اس لئے مستحسن ہے کہ انہیں زندگی کے تلخ حقائق کی آگاہی کے ساتھ ساتھ شاعری میں "حسین خوابوں" کی اہمیت اور معنویت کا گہرا شعور رہا ہے۔ حالانکہ یہ احساس ہمیں ان کی شاعری میں صرف کہیں کہیں ملتا ہے لیکن جہاں کہیں بھی انہوں نے اس احساس کے تحت شعر کہا ہے وہاں اپنی ادبی دیانت داری اور فنی خلوص کو "دورِ حقیقت" کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھنے سے بچایا ہے۔ ان کی ایک نظم "پہلی موت" اس کی بہترین مثال ہے۔ اس قسم کی اور بھی نظمیں اس مجموعے میں ملتی ہیں جہاں باقر مہدی نے تلخ حقائق کے اعتراف کے ساتھ فن کی اہمیت کا اقرار کیا ہے۔

باقر مہدی کے کلام کے سرسری مطالعے سے یہ پتہ لگا لینا مشکل نہیں ہے کہ ان کی غزلوں نظموں کا اصلی موضوع محبت اور زندگی کی محرومیاں اور ناکامیاں ہیں۔ بعض نظموں کی شدید جذباتیت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ شاعر کو اپنی زندگی کے جذباتی اور نفسیاتی رشتوں کا بے حد پاس رہا ہے۔ محبت، محرومی اور غم کی جن منزلوں سے ان کو گذرنا پڑا ہے اس کا ایک ایک پہلو فنکارانہ صداقت اور خلوص کے ساتھ اجاگر کرنے کی جابجا کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں "غم کدے میں اجنبی" "بہت بے ایک نظر" اور "آج کے بعد" جیسی نظمیں قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن ہم ان نظموں کے مطالعے سے صرف شاعر کے جذباتی ردِ عمل کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ان نظموں میں جذبے کا خلوص ہے۔ لیکن کہیں بھی گہری فکر کا عنصر نہیں ملتا۔ جذبہ اور فکر کی آمیزش کے بغیر عظیم شاعری کی تخلیق کا تصور نہیں

کیا جا سکتا۔ اس بات کا شاعر کو بھی احساس ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے اپنی بعض نظموں میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنی جذباتیت کو سلام کر کے "حیات فکر و نظر سے حیات بنتی ہے" کی باتیں کرتے ہیں۔ اور ترکِ محبت کی قسم کھاتے ہیں (" آج کے بعد ") لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ "آج کے بعد" والی نظم کے فوراً ہی بعد اسی سال (۱۹۵۲ء) انہوں نے دوسری نظم کہی ہے۔ جو یوں شروع ہوتی ہے!:-

بھول جانا انہیں آسان نہیں ہے اے دل ؛ تو نے پہلے بھی کئی بار قسم کھائی ہے

درد جب حد سے بڑھا ضبط کا یارا نہ رہا ؛ ان کی ایک ایک ادا یاد مجھے آئی ہے

یہاں مجھے نظم کے حسن سے قطعِ نظر صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ شاعر گھوم پھر کر اسی روشنی کی طرف لوٹنے پر مجبور ہے جس سے اس کے تخیل کی پر اسرار راہیں منور ہیں۔ جس سے اس کے دل کا خانہ تاریک نور حاصل کرتا ہے۔ اس بنا پر میں نے ابتدا میں کہا ہے کہ باقر مہدی کا موضوع محبت اور اس کی لازوال کسک ہے۔ اگر کہیں انہوں نے اس مرکز کو چھوڑا بھی ہے تو محض چند ہی لمحوں کے لئے۔ "نئے سوال" میں شاعر اپنے محبوب موضوع سے ہٹ کر حیات و کائنات کے متعلق سوچتا ہے۔ زندگی، خدا اور خدائی کے مدعا پر غور و فکر کر چکنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے۔

یہ وہ سوال ہیں جن کے جواب کی خاطر ؛ جلائی فکر نے مشعل اٹھے عمل کے قدم

کسی نے دل میں کہا "مرحبا بڑھے جاؤ" ؛ اٹھائے دوش پہ اپنے بغاوتوں کے علم

اس دور کے بہت سے شاعروں نے فکر کی مشعل کی رہنمائی میں زندگی کے دکھوں اور غموں کا جو مجرب نسخہ ڈھونڈ نکالا ہے وہ ہے بغاوت — باقر مہدی بھی اپنی اس دریافت سے مطمئن اور پُر امید ہو کر اپنے فلسفۂ حیات کو بالآخر یوں SUM UP کرتے ہیں۔

"ایک فنکار ہوں باغی ہوں یہی کیا کم ہے"

"زیرِ تبصرہ مجموعے کے دیباچے میں احتشام حسین نے اس بات پر زور دیتے ہوئے کہا ہے کہ باقر مہدی کو فن کار شاعر اور باغی کے منصب کا شدید احساس ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک شاعر کو اپنے اس سماجی منصب کا احساس نہ ہو اسے ذمہ داری کا احساس بھی نہیں ہو سکتا ...... باقر مہدی اس احساس کو عزیز رکھتے ہیں۔

اس اقتباس سے شاعر اور شاعری کے متعلق جس قسم کا نظریہ تشکیل پاتا ہے اس کی

گونج اس دور کے ہر اس شاعر کے یہاں سنائی دیتی ہے۔ جس کو سماجی منصب کا یہ احساس عزیز رہا ہے۔ بعض شاعروں نے بغاوت کے اس نظریے کو اپنی انقلابی شاعری کا اوڑھنا اور بچھونا بنا لیا ہے۔ زندگی کی ناآسودگیوں محرومیوں اور سماجی ناانصافیوں سے پیدا شدہ جھنجھلاہٹ کو بغاوت سے تعبیر کر کے اسے فلسفۂ حیات سمجھ لینا فکر و ذہن کی گمراہی ہے۔ اس دور کی تقریباً بہت ساری شاعری بغاوت کے موضوع کے بوجھ تلے دبی پڑی ہے۔ یہ موضوع ادب اور شاعری کے لئے شجر ممنوع نہیں ہے۔ لیکن سطحی پن کے ساتھ اس کا استعمال شاعری کی لطافت کو مجروح کر دیتا ہے۔ اور اس سے اس مقصد کی تکمیل بھی نہیں ہو سکتی۔ جس کے لئے یہ استعمال ہوا ہے۔ افلاطون اور ارسطو کے زمانے سے لے کر آج تک انسان کو ہمیشہ بہتر نظام حیات کی خواہش رہی ہے لیکن باقر مہدی جس فلسفۂ حیات سے انسانی زندگی کے نظام میں تبدیلی اور انقلاب کے خواہش مند ہیں اس کے متعلق فکری لحاظ سے انہوں نے کہیں بھی بھرپور اظہار نہیں کیا ہے احتشام حسین کا خیال ہے کہ اس کے بھرپور اظہار کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ لیکن اس بات کو آسانی سے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے "ایک فنکار ہوں باغی ہوں۔ یہی کیا کم ہے"۔ یا "اٹھائے دوش پہ اپنے بغاوتوں کے علم" ہی کافی نہیں ہیں۔ اس سے شاعری کی بغاوت کی سمت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اور نہ اس بغاوت کے پیچھے کوئی مربوط فکر نظر آتی ہے۔

بہ حیثیت مجموعی "شہر آرزو" باقر مہدی کی شاعری کے متعلق کافی خوشگوار توقعات کو پیدا کرتا ہے۔ لیکن ان توقعات کو پورا کرنے کے لئے انہیں بہت محنت اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ باقر مہدی کو شاعری میں الفاظ کی قدر و قیمت اور ان کی تاثر آفرینی کا اندازہ کرنے کا بہت اچھا سلیقہ ہے۔ اور یہ چیز "شہر آرزو" کے قطعات میں زیادہ نمایاں ہے۔ نظموں میں "یہ سفر" "نوید" "ہم لوگ" "غم کدے میں اجنبی" اور "شہر آرزو" مجموعہ کی بہترین نظمیں ہیں۔ ان کی بعض ..... غزلوں میں نظم کا اثر صاف نمایاں ہے۔ ایجاز اور ایمائیت غزل کی جان ہیں۔ نظموں کا سا کھل کر کہنے کا انداز غزل کے مزاج کو راس نہیں آتا۔

"شہر آرزو" بڑی حد تک زبان و بیان کے اسقام سے پاک ہے۔ بعض مقامات پر بعید از کار تشبیہیں استعمال ہوئی ہیں جیسے۔

کتنے طوفان ہوں شمعِ امید
چاک دل پھر بھی سئے جاتی ہے

لیکن ایسی لغزشیں زیادہ نہیں ہیں۔ "شہر آرزو" صوری اعتبار سے بھی دیدہ زیب نکلا ہے۔ پلاسٹک کی جلد بہت خوبصورت ہے

بقیہ ۱۰ اجنبی

میرے وکیل کی آواز دور سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔ وہ اپنی آخری اپیل ختم کر رہا تھا۔ اس کے بعد جیوری کے اراکین فیصلہ کرنے کے لئے اٹھ کر اندر چلے گئے۔ میری، سلیستے اور ریمنڈ کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی جیسے تسلی دے رہی ہو "فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آنے والے روشن دن ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔" لیکن میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرا بھی نہ سکا۔

کوئی پون گھنٹے کے بعد جیوری واپس ہو گئی۔ فرانسیسی عوام کے مفاد اور قانون کے تحفظ کے نام پر مجھے سزائے موت سنا دی گئی۔

لوگوں کے چہروں سے ان کے تاثرات جھلک رہے تھے، ایک ترحم آمیز احترام کا اظہار ہو رہا تھا۔ پولیس کے سپاہی بھی میرے ساتھ نرمی برت رہے تھے۔ میرا ذہن سوچنے سے عاری ہو چکا تھا۔ جج کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ مجھے آخری بار کچھ کہنے کی اجازت دے رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے میں رکا اور پھر میں نے آہستہ سے کہا "مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔"

میں نے ابھی تیسری مرتبہ پادری سے ملنے سے انکار کر دیا ہے۔ میرے پاس اس سے کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ ویسے بھی ایک بار تو اس سے ملاقات ہو ہی چکی ہے۔ اس وقت مجھے صرف ایک خیال ستا رہا ہے، تختہ دار سے بچ نکلنے کی کیا ترکیب ہو سکتی ہے۔ کیا ناگزیر کو کسی طرح ٹالا جا سکتا ہے؟

مجھے دوسری کوٹھری میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ جہاں سے میں لیٹے ہوئے آسمان کو دیکھتا رہتا ہوں۔ دیکھنے کے لئے رکھا بھی کیا ہے۔ میرا سارا وقت آسمان کے بدلتے ہوئے رنگوں کو دیکھنے میں گذرتا ہے۔ آہستہ آہستہ دن رات کی سیاہی میں گم ہو جاتا ہے۔

اب میرے اعصاب پر یہی ایک فکر طاری ہے کہ اس صورتِ حال سے فرار کا کیا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کیا کبھی کوئی مجرم انصاف کے نہ بخشنے والے پھندے سے نکل کر پہرے والوں سے بچ کر عین موقع پر اپنی جان سلامت لے جا سکا ہوگا؟ اب مجھے افسوس ہے کہ میں نے کیوں ایسی کتابیں نہیں پڑھیں جن میں مجرموں کے فرار کی تفصیلات مل سکتی تھیں۔ ان کتابوں میں یقیناً مجھے بھی کوئی صورت بھاگ نکلنے کی نظر آجاتی۔ کوئی ایک ذریعہ، ایک

نادر موقع، کوئی ایک اتفاق یا خوش قسمتی جو بے رحم حالات کی گرفت سے رہائی بخش سکے، صرف ایک بار، اگر کچھ نہیں تو کم از کم صرف باہر نکل سکنے کا ایک موقع، خواہ اس کا نتیجہ گلی کے نکڑ پر کھڑے ہوئے سپاہی کی گولی کا شکار ہونا ہی کیوں نہ ہو۔ آزادی کے لئے ایک مرتبہ دیوانہ وار ٹکرا جانے کی کوشش، امید کا جو ایک لمحہ، آرزو کی جو ایک شعاع بخش سکے گی، وہ میرے لئے بہت بڑی بات ہوتی۔ لیکن میرے لئے یہ امکان بھی بعید از قیاس ہے۔ میں اس چوہے دان میں ہمیشہ کے لئے پھنس چکا ہوں۔

کبھی یہ خیال آتا ہے کہ اگر کسی طرح قانون میں ترمیم کر کے سزائے موت گلوٹین کی بجائے زہریلی دواؤں سے دی جاتی تو اس طریقہ میں کم از کم ہزار میں ایک موقع تو مجرم کے بچ نکلنے کا ہو سکتا تھا۔ لیکن موجودہ طریقہ میں بچ نکلنے کی کوئی صورت ہی نہیں۔

مجھے ان لمحات میں میرے باپ کے متعلق میری ماں کا بتایا ہوا ایک واقعہ یاد آتا تھا۔ میں نے کبھی اپنے باپ کو نہیں دیکھا۔ مجھے اس کے متعلق صرف انہیں باتوں کا علم تھا جو میں نے ماں سے سنی تھیں۔ ماں کہتی تھی کہ ایک بار وہ کسی مجرم کی سزائے قتل کا منظر دیکھنے گیا، اور واپس لوٹا تو اس کی طبیعت بے حد خراب ہو گئی تھی۔ اس وقت مجھے میرے باپ کی یہ حرکت بڑی نفرت انگیز معلوم ہوئی لیکن اب مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ اس کی خواہش بالکل فطری تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اگر میں کبھی یہاں سے بچ کر نکل سکا تو ہمیشہ پھانسی کی سزا دیکھنے جایا کروں گا۔ کچھ لمحوں کے لئے میں نے اپنے آپ کو قید سے آزاد تصور کر لیا۔ پولیس کی دوہری قطار کے پیچھے کھڑے ہوئے کسی کو گلوٹین کا شکار ہوتے ہوئے دیکھنا اور پھر گھر واپس جا کر کراہت سے قے کر دینا۔ اس خیال سے مجھے اس قدر مسرت اور خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ میں کچھ دیر کے لئے اپنے آپے سے باہر ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح تخیل کی بے راہروی کا شکار ہو جانا بے وقوفی تھی۔ لیکن آخر آدمی ہمیشہ تو خردمند نہیں بنا رہ سکتا۔

دن بیت رہے ہیں۔ میں اپنے دل کی دھڑکن سنتا ہوں تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اتنے دن میرا ساتھ دینے کے بعد ایک صبح یہ دھڑکن بند ہو جائے گی۔ مجھے معلوم تھا کہ ہر روز صبح ہی سپاہی کسی نہ کسی کو اس کی آخری منزل تک پہنچانے کے لئے لینے آتے ہیں۔ اس لئے ہر رات میں صبح میں آنے والے قدموں کی آہٹ کے انتظار میں جاگتے جاگتے

گذار دیتا۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی چیز غیر متوقع طور پر ہو جائے۔ وہ جب مجھے لینے کے لئے آئیں تو مجھے تیار رہنا چاہئے۔ ہر رات میں یہی خیال رہتا ہوں کہ یہ رات زندگی کی آخری رات ہے اور آنے والی صبح میری آخری صبح ہوگی۔ اس انتظار میں میں رات کو جاگتا ہوں اور دن کو سوتا ہوں۔ جیسے جیسے رات گذرتی ہے میری بیقراری بڑھتی جاتی ہے۔ ایک اعتبار سے میں خوش قسمت نکلا کیونکہ میرے آخری دن تک بھی سپاہی کسی دوسرے کو بلانے کے لئے نہیں آئے۔ اور قدموں کی جس چاپ کا میں منتظر رہتا تھا وہ کبھی سنائی نہیں دی۔ ماں کہتی تھی کہ بری سی بری حالت میں بھی آدمی کے پاس شکر ادا کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوتی ہے۔ اب مجھے اس کا یقین آیا۔ اسی بیقراری میں رات گذر جاتی۔ صبح آتی تو میری زندگی میں مزید چوبیس گھنٹوں کا اضافہ ہو جاتا۔

کبھی کبھی یہ بھی سوچتا ہوں کہ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ آج مروں یا چالیس برس بعد، مرنا تو بہر حال ہے ہی لیکن دل کو تسلی نہیں ہوتی۔ جتنے برس بھی زندہ رہوں گا، نہ جانے کیا کیا کروں گا۔ لیٹے لیٹے میری کا خیال آتا ہے۔ اس کا کوئی خط نہیں آیا۔ جس کو سزائے موت کا حکم سنا دیا جائے اس کی کون فکر کرتا ہے؟ کسی کو کیا غرض ہے کہ ایک قاتل سے دلچسپی لے۔ پھر خیال آتا ہے شاید وہ بیمار ہو یا شاید مر گئی ہو۔ آخر ایسا ہونا کچھ ناممکن بھی تو نہیں اور پھر مجھے اس کا پتہ بھی کیسے لگتا۔ ہمارے درمیان اپنے جسموں کے علاوہ، جو اب بچھڑ چکے ہیں، کوئی ایسی قدر مشترک بھی تو نہیں تھی جو ہمیں ایک دوسرے کی یاد دلا سکے۔ اگر وہ مر جائے تو میرے لئے اس کی یاد بے معنی ہو جائے گی۔ ایک مردہ لڑکی سے مجھے کوئی دلچسپی نہ ہوتی۔ مجھے اس رویہ میں کوئی غیر فطری بات معلوم نہیں ہوتی کیونکہ آخر مجھے بھی تو لوگ میری موت کے بعد اسی طرح بھول جائیں گے۔ دراصل حالات سے سمجھوتہ کرنے کی صلاحیت انسان میں ودیعت کردہ ہے۔

میں انہی خیالات میں گم تھا کہ بغیر اطلاع دئے پادری اندر آگیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ وقت سے پہلے آگیا ہے۔ اسے تو میرے آخری وقت سے کچھ دیر پہلے آنا تھا۔ وہ خاموش رہا اور میرے بستر پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر وہ اسی طرح اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے خاموش بیٹھا رہا۔

ایکاایک اس نے سر اٹھایا اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا "تم

مجھ سے ملنے سے انکار کیوں کر رہے تھے؟" "اس لئے کہ مجھے خدا پر یقین نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "کہیں بے بسی اور ناکامی کے شدید احساس کی وجہ سے تو تم ایسی باتیں نہیں سوچ رہے ہو؟" پادری نے پوچھا۔ میں نے کہا "بے بسی سے زیادہ مجھ پر خوف طاری ہے اور یہ فطری بات ہے۔" "پھر خدا تمہاری مدد کر سکتا ہے۔" پادری نے کہا۔ "میں نے جتنے بھی لوگ تمہاری حالت میں دیکھے ہیں سب نے اپنی مشکلات کے وقت اسی کا سہارا ڈھونڈا ہے۔ تم اپنے کندھوں پر جرم و گناہ کا عظیم بار اٹھائے ہوئے ہو۔ تمہیں اس بوجھ سے رہائی حاصل کرنا ہے۔ انسان کا انصاف تو کوئی چیز نہیں اصل انصاف تو خالق حقیقی کا ہوتا ہے۔ تمہارے لئے جو سزا تجویز کی گئی ہے اس سے تمہارا گناہ ہلکا نہیں ہوتا۔ تمہیں اپنی روح کا بوجھ دور کرنے کے لئے توبہ کرنی چاہئے۔" میں نے جواب دیا "میرا دل گناہ کے احساس سے پاک ہے۔ مجھ سے ایک جرم سرزد ہوا اور میں اس کی سزا بھگت رہا ہوں۔ اس میں احساسِ گناہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

پادری کچھ دیر تک مجھے سوگوارانہ انداز میں دیکھتا رہا۔ میں دیوار کی طرف اپنی پشت کئے کھڑا رہا۔ میرے چہرے پر سورج کی شعاعیں پڑ رہی تھیں۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پادری نے پوچھا "کیا واقعی تمہیں موت کے بعد دوسری زندگی کی خواہش کبھی نہیں ہوئی؟" میں نے کہا "خواہش تو سب کو ہوتی ہے لیکن خواہش کے ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ لوگ دولت کی خواہش کرتے ہیں، خوبصورتی کی خواہش کرتے ہیں کسی چیز میں کمال حاصل کرنے کی خواہش کرتے ہیں، اسی طرح دوسری زندگی کی بھی انسان بعض لمحوں میں خواہش کرتا ہے۔ اس خواہش اور دوسری خواہشوں میں کوئی فرق نہیں۔" "تمہارا دل پتھر کا ہو گیا ہے۔" پادری نے کہا "میرے بیٹے مگر میں تمہارے لئے دعا کروں گا۔"

پتہ نہیں اس کے بعد مجھے کیا ہوا۔ میرے سینے میں جیسے کوئی چیز ٹوٹ رہی تھی۔ پادری کے کالر کو دونوں ہاتھوں سے جھنجھوڑ کر میں پوری آواز سے چلانے لگا۔ میرے دماغ میں کھولتے ہوئے خیالات کا لاوا بہہ نکلا۔ اسے اپنے خیالات اور نظریات پر آنا یقین اور اعتماد تھا کہ مجھے اس سے چڑ سی ہونے لگی تھی اور پھر اس کے

سارے تیقنات پرکاہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے ۔ وہ ایسی بے روح زندگی گذار رہا
تھا کہ اسے اپنی زندگی کا بھی یقین نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اس کے مقابلے میں شاید میں اچھی مایہ
نظر آؤں لیکن درحقیقت میں اس سے کہیں زیادہ متیقن تھا ۔ اپنی موجودہ زندگی
آنے والی موت کا مجھے جتنا قطعی احساس تھا وہ اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا ۔ میں راستی
پر تھا اور اب بھی راستی پر ہوں ۔ میں نے اپنی زندگی ایک نہج پر گذار دی ۔ اگر میں
چاہتا تو اسے دوسری طرح بھی گذار سکتا تھا ۔ زندگی میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا
کہ میں نے کیوں ایک کام کیا اور کیوں دوسرا کام نہیں کیا ۔ میری زندگی کا ہر لمحہ،
ہر عمل اس موجودہ لمحہ کے انتظار میں تھا۔ اس آنے والی صبح کے انتظار میں جو شاید کل،
یا شاید پرسوں، میری زندگی کا جواز فراہم کر دے گی ۔ اس کے علاوہ کوئی چیز، کوئی شے
اہم یا وقیع نہیں ہے، اس بات کا میرے ساتھ اسے بھی علم ہے ۔ میرے مستقبل کے
تاریک افق سے زندگی بھر گرد و باد کی دھیمی اور مسلسل لہریں میری طرف آتی رہیں ۔
میری زندگی کے آنے والے برسوں کی طرف سے حال کے ان غیر حقیقی برسوں تک آتے
آتے، جن میں میں زندگی گذار رہا تھا، خاک و باد کی اس مسلسل یورش نے ان سارے خیالات
کے نقوش مٹا دیئے جنہیں لوگوں نے مجھ سے منسوب کرنے کی کوششیں کیں ۔ پھر میرے لئے
لوگوں کی موت، ماں کی محبت یا اس کے خدا کا وجود کیا فرق پیدا کر سکتا تھا؟ ارادہ
اختیار سے کسی بہتر یا مختلف طریقہ سے زندگی گذارنے سے کیا فرق پڑ سکتا ہے جبکہ
ایک ہی ناقابلِ ترمیم و تنسیخ انجام سب کے لئے مقرر ہو چکا ہے؟ موت کا حکم تو سب
کے لئے صادر ہو چکا ہے، میرے لئے بھی اور اس کے لئے بھی ۔ اب اس سے کیا ہوتا
ہے کہ کسی کو قتل کے الزام میں، اپنی ماں کی موت پر آنسو نہ بہانے کی وجہ سے نذرِ
اجل کیا جائے یا کسی اور طرح زندگی کا خاتمہ ہو ۔ آخر انجام تو سب کا ایک ہی ہے اور
اس احساس کے بعد زندگی کے سارے تعلقات، رشتے اور جھگڑے بے معنی ہو جاتے
ہیں ۔ پادری بھی میری طرح موت کے سائے میں جی رہا ہے ۔ اس کی موت کا بھی تعین
ہو چکا ہے ۔ مجھ میں اور اس میں کوئی فرق نہیں لیکن مجھے تعجب ہے کہ اس کے باوجود جب
میں اپنے مستقبل کی طرف سے آنے والی آندھی کا ذکر کرتا ہوں تو وہ اسے سمجھ نہیں پایا؟

میں چلّاتے چلّاتے بے دم ہو گیا۔ وارڈن نے مداخلت کر کے پادری کو میری گرفت سے چھڑا لیا۔ پادری کچھ دیر خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ اسی خاموشی سے کمرے کے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں تھک کر لیٹ گیا۔ کمزوری کی وجہ سے پڑتے ہی نیند آ گئی۔ جب میری آنکھیں کھلیں تو آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے۔ قصبے کی آوازیں مدھم طور پر آ رہی تھیں۔ زمین اور سمندر کی نمکین بو، رات کی خنک ہوا میں بسی ہوئی میرے رخساروں کو چھو رہی تھی۔ گرمیوں کی اس خوابیدہ رات کا سکون ایک لہر بن کر میرے وجود میں پھیل گیا۔ آہستہ آہستہ صبح قریب آتی گئی۔ دور سے ایک جہاز کا سائرن سنائی دیا۔ لوگ ایک ایسی دنیا میں سفر کی تیاری کر رہے تھے جو ہمیشہ کے لئے مجھ سے قطع تعلق کر چکی تھی۔ کئی مہینے بعد پہلی دفعہ مجھے ماں کی یاد آئی۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اس نے پیری سے کیوں دوستی بڑھالی تھی۔ وہاں آشرم پر بھی تو موت کا سایہ طاری تھا۔ وہاں بھی تو ہر شام ایک المناک تسلی لئے آتی تھی۔ موت سے اتنا قریب ہو کر ماں نے محسوس کیا ہو گا کہ وہ عنقریب آزاد ہو کر ایک نئی زندگی کا آغاز کرے گی۔ دنیا میں کسی کو اس پر رونے یا ماتم کرنے کا حق نہیں تھا۔ اب میں بھی ایک نئی زندگی کے سفر کے لئے تیار تھا۔ پادری پر برس پڑنے کے بعد، غیظ و غضب کے وہ جذبات مجھے ہر امید سے خالی کر کے گویا میری تطہیر کر گئے تھے، اور ستاروں سے مزین آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے پہلی بار میں نے کائنات کی شفیق بے نیازی کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے۔

اب فقط اس دن کا انتظار ہے جب لوگوں کا ہجوم مجھے پھانسی پر چڑھتے دیکھنے کے لئے آئے گا اور مجھ پر نفرین بھیجے گا۔